المنار

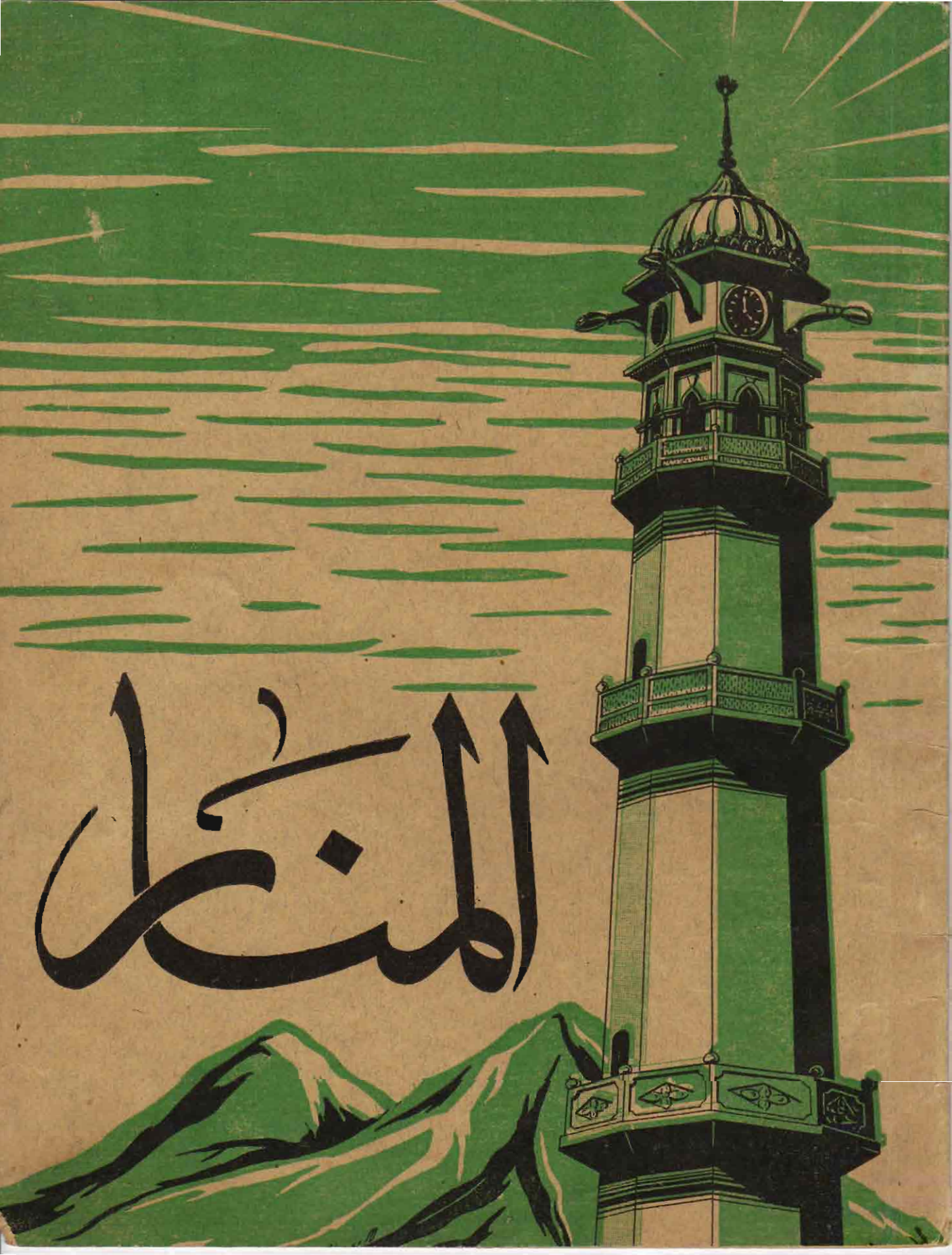

بسم اللہ الرحمن الرحیم

روشنی اور بلندی کا نشان

المنار

جلد (۴)، شمارہ (۲)،

تعلیم الاسلام کالج لاہور

فروری ۱۹۵۴ء
۱۳۳۳ ہش

نگران
شیخ محبوب عالم خالد
بی۔اے (آنرز) ایم۔اے

مدیر اعلیٰ
مطیع اللہ درد
نائبین:۔ سمیع اللہ قریشی
سعد اللہ درانی

فہرست

عنوان	مضمون نگار	صفحہ
اداریہ	م۔د۔د	۲
طلبہ سے خطاب	حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد ایدہ اللہ	۳
ایک درخشاں باب	قائدِ اعظم	۴
الجھنیں	مطیع اللہ درد	۵
نذرِ غالب	قاصد ظریف	۶
عینک کے بغیر	سمیع اللہ قریشی	۷
واردات	"	۹
تصوراتِ محمود	محمود شیرانی	"
احساسِ معیت	مطیع اللہ درد	۱۰
یہ انسان کہاں ہیں؟	محمد زکریا طاہر	۱۱
گل	سجاد ظہیر سید	"
گل و خار	جمیل احمد خاں	۱۲
سچے مسلمان کیلئے غیرت کا مقام	حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد ایدہ اللہ	۱۳
دیکھتا چلا گیا	تکلفی	۱۴
حالی ایک نقاد کی حیثیت سے	جنید ہاشمی بی۔اے	۱۵
چند لمحے ٹیپو سلطان کے مزار پر	عبدالباسط وحید	۱۶

پبلشر جنید ہاشمی نے لائن پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

م - ا - د

اداریہ

پچھلے دنوں کراچی میل کے حادثہ عظیم کی خبر سنکر پاکستان بھر میں رنج والم کی لہر دوڑ گئی - اس خوفناک حادثہ کی وجہ سے بے اندازہ جانیں تلف ہوئیں - جن میں معصوم بچے بوڑھے اور جوان عورتیں اور مرد سبھی شامل تھے۔

پاکستان میں جس تیز رفتاری کے ساتھ اس قسم کے حادثے رونما ہو رہے ہیں وہ ہر ذی شعور محب وطن پاکستانی کو یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ قوم کا قیمتی خون اس طرح سے کیوں بہہ رہا ہے - جسے ہم نے لاکھوں بہو بیٹیوں کی عزت کی بھینٹ چڑھا کر لاکھوں افراد کا خون بہا کر ہر قسم کی قربانی دے کر بچایا تھا - اور پاکستان کی بنیادیں انہیں قربانیوں پر استوار کی تھیں - آج اسی سرزمین میں ہم اپنے گراں بہا خون اور مالی نقصان کو برداشت کرنے پر مجبور و بے بس ہو رہے ہیں۔

ریل گاڑیوں اور ہوائی جہازوں کے پے در پے حادثے آج ساری ملت کو خون کے آنسو رلا رہے ہیں - انہیں حادثوں میں پاکستان کو قیمتی دماغوں سے ہاتھ دھونا پڑے - جانی اور مالی نقصانات برداشت کرنا پڑے - ارباب حل وعقد کا فرض ہے کہ وہ ان کے سدّباب کی طرف توجہ فرمائیں - تاکہ قوم کو اس قسم کے مزید نقصانات کا سامنا نہ کرنا پڑے - قوم کے جان و مال اور عزت کو کسی ایسے وقت کے لئے وقف رہنے دیں جو ملک کے شدید ترین ضرورتوں میں کام آسکے - ملت بلا مقصد اتنا عظیم نقصان فراموش کرنے میں کچھ وقت لے گی۔

آخر میں ادارہ "المنار" اس حادثہ عظیم کے مصیبت زدگان اور ان کے لواحقین سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور دست بدعا ہے کہ اللہ تعالےٰ انہیں اپنے قرب میں جگہ دے اور ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو صبر جمیل عطا فرمائے - آمین ؛

تعلیم الاسلام کالج کے اساتذہ اور طلباء کی طرف سے اس حادثہ کے مصیبت زدگان کی امداد کے لئے گورنر جنرل فنڈ کھولنے کی تجویز پیش کی گئی ہے - اس فنڈ میں اساتذہ اور طلبہ نے فی الحال دو صد روپیہ کی پیش کش کی ہے امید ہے کہ ارباب حل وعقد اور مخیر اصحاب اس کی طرف فوری توجہ فرمائیں گے ؛

انشاء اللہ ؛

پچھلے دنوں تعلیم الاسلام کالج کے مقررین کے ایک وفد نے کوئٹہ میں آل پاکستان لیاقت میموریل مباحثات میں جو نمایاں کامیابی حاصل کی - وہ قابلِ ستائش ہے - انہوں نے انگریزی اور اردو دونوں مباحثات میں ٹرافیاں حاصل کیں - ادارہ "المنار" مقررین کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے دعاگو ہے کہ اللہ تعالےٰ آئندہ اس سے زیادہ شاندار طریق پر انہیں تعلیم الاسلام کالج کی نیک نامی اور شہرت میں اضافہ کی توفیق عطا فرمائے - آمین ؛

ماہ رواں کا آغاز ہماری مجلس علمی کے زیر اہتمام کل پاکستان بین الکلیاتی تقریری مقابلوں کی گہما گہمی سے ہوا - مقابلے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ہوئے جن میں پاکستان بھر کے مختلف کالجوں کے مقررین نے حصہ لیا - جو کوئٹہ - کراچی پشاور - راولپنڈی - سرگودھا - بہاولپور اور لاہور کے مختلف کالجوں سے تشریف لائے تھے - ہمارے کالج کی طرف سے ان تقریری مقابلوں میں بشیر الدین احمد - چوہدری عبدالرحمٰن عبداللہ عثمان عمر اور عبدالوحید سلیم نے حصہ لیا - موضوع کے اعتبار سے تقاریر خاصی دلچسپ اور مدلل تھیں - ڈاکٹر برکت علی قریشی پرنسپل اورینٹل کالج لاہور - مولانا علاؤ الدین صدیقی صدر شعبۂ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی اور صوفی بشارت الرحمٰن ایم - اے نے اردو اور ملک عبدالقیوم پرنسپل لاء کالج لاہور - قاضی محمد اسلم وائس پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور اور امریکن انفرمیشن سروس کے ایک آفیسر نے انگریزی مقابلوں میں منصفین کے فرائض انجام دیئے - انگریزی اور اردو دونوں تقریری مقابلوں میں نتیجہ بالترتیب یہ رہا - اول انعام ؛ محمود ملک گورنمنٹ کالج لاہور انگریزی

انگریزی	اول انعام ؛	محمود ملک گورنمنٹ کالج لاہور	
,,	دوم ,, ؛	مس ناہید بشیر گورنمنٹ کالج کوئٹہ	
,,	سوم ,, ؛	محمد انور - ہیلی کالج آف کامرس لاہور	
اُردو	اوّل انعام ؛	لئیق احمد - گورنمنٹ کالج لاہور	
,,	دوم ,, ؛	ظفر احمد - N E D کالج کراچی	

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد ایدہ اللہ

طلبہ سے خطاب

دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ادوار میں بنی نوع انسان کا قدم ترقی کی ایک خاص جہت کی طرف اُٹھا ہے۔ کسی وقت فلسفہ کا دور آیا ہے تو کسی وقت ادب کا۔ کسی وقت اخلاق کا دور آیا ہے تو کسی وقت فنونِ لطیفہ کا۔ کسی وقت قانون سازی کا دور آیا ہے تو کسی وقت تہور و شجاعت کا۔ غرض اچھے انسانی دماغوں میں ہر زمانہ میں ایک ہم آہنگی معلوم ہوتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمِ بالا کی کشش ہر زمانہ کے اعلیٰ دماغوں کو اس زمانہ کے صفاتی دور کی طرف کھینچنے میں لگی رہتی ہے اور اس فن میں انسانی دماغ زیادہ ترقی کر جاتا ہے جس طرح کہ صفاتِ باری اس وقت اشارہ کر رہی ہوتی ہیں۔ قرآن کریم نے اسے "ملاءِ اعلیٰ" کی مشاورت کا نام دیا ہے۔ یہ آسمانی فیصلے جس طرح روحانی امور کے متعلق ہوتے ہیں اسی طرح دنیوی علوم کے متعلق بھی ہوتے ہیں اور وہ دماغ جو اپنا زاویہ صفاتِ باری کے موجودہ زاویہ کے عین مطابق کر دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اپنے زمانے کے اور اپنے فن کے راہنما بننے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور تاریخ میں ایک نام پیدا کر لیتے ہیں۔

اس کی طرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دعائے استخارہ سے اشارہ کیا ہے۔ انسان بے شک اپنی محنت کا پھل کھاتا ہے۔ لیکن بے موسم محنت بھی تو رائیگاں جاتی ہے۔ شاید ہر غلّہ سال کے ہر حصہ میں بویا جا سکتا ہے۔ اور کچھ نہ کچھ روئیدگی بھی اس سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن وہ غلّہ جو اپنے موسم میں بویا جاتا ہے اس کی کیفیت ہی اور ہوتی ہے۔ اسی طرح شائد ہر غلّہ ہر ملک میں بویا جا سکتا ہے لیکن وہ غلّہ جو اس ملک میں بویا جاتا ہے جس کی زمین کو اس غلّہ سے مناسبت ہے اس کی کیفیت ہی اور ہوتی ہے۔ ہر انسان کے لئے ہر علم کا حاصل ہونا اور ہر قسم کا کام کرنا ممکن ہے لیکن ہر فن میں اس کا صاحبِ کمال ہونا ضروری نہیں۔ اس کے دماغ کی مخفی قابلیتوں کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ وہی جانتا ہے کہ مختلف مفید علوم میں سے کونسا علم اور مختلف مفید کاموں میں سے کونسا کام اس کی طاقتوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اور اس کے زمانہ اور اس کے ملک اور اس کی قوم کی ضرورتوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اس کے لئے مناسب ہے۔ پس فرمایا۔ کہ خواہ اچھے سے اچھا کام ہو اس کے شروع کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے دُعا کر لیا کرو جس کے الفاظ آپ نے یہ تجویز فرمائے ہیں:۔

اللّٰھم انی استخیرك بعلمك واستقدرك بقدرتك واسئلك من فضلك العظیم فانك تقدر ولا اقدر وتعلم ولا اعلم وانت علّام الغیوب اللّٰھم ان کنت تعلم ان ھٰذا الامر خیر لی فی دینی ومعاشی وعاقبة امری فاقدرہ لی ویسّرہ لی ثمّ بارك لی فیہ۔ اللّٰھم ان کنت تعلم ان ھذا الامر شرّ لی فی دینی ومعاشی وعاقبة امری فاصرفہ عنی واصرفنی عنہ واقدر لی الخیر حیث کان ثمّ ارضنی بہ۔

یعنی اے میرے ربّ! جو کام میں کرنے لگا ہوں یا جو علم میں حاصل کرنے لگا ہوں یا جو ذمہ داری میں اٹھانے لگا ہوں اسکے بارہ میں تجھ سے جو میری مخفی طاقتوں سے بھی واقف ہے۔ اپنے زمانہ کے مآل کے متعلق ارادوں سے بھی واقف ہے اور میری ذاتی خاندانی قومی ملکی اور عالمگیری ضرورتوں اور ذمہ داریوں سے بھی واقف ہے ربّ بہتر فیصلہ طلب کرتا ہوں۔ اور پھر تجھ سے یہ بھی درخواست کرتا ہوں کہ اس فیصلہ کے مطابق مجھے کام کرنے کی تجھ سے توفیق اور امداد حاصل ہو۔ اور تیسری بات تجھ سے یہ طلب کرتا ہوں کہ جو بات میرے لئے مناسب ہو اور جس کی طرف تو میری راہنمائی کرے اور جس کے حاصل کرنے کے لئے تو میری مدد کرے اس کام یا اس ذمہ داری کے ادا کرنے میں تیرا انتہائی فضل مجھ پر نازل ہو۔ اور میں اس کام میں ادنیٰ مقام حاصل نہ کروں بلکہ مجھے اس کام میں اعلیٰ مقام حاصل ہو۔ میں تجھ سے یونہی اور

بلاوجہ یہ درخواست نہیں کرتا۔ بلکہ اس وجہ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ جن امور کے پورا کرنے کی مجھے طاقت نہیں بخشے ہے۔ اور جن مخفی باتوں کا مجھے علم نہیں بخشے ہے۔ پس اے خدا! اگر تیرے علم میں وہ کام جو میں کرنا چاہتا ہوں میرے لئے اچھا ہے میری دینی ضرورتوں کے لحاظ سے بھی اور میری دنیوی ضرورتوں کے لحاظ سے بھی اور اس لحاظ سے بھی کہ جو طاقت اور محنت میں اس کام میں خرچ کرونگا۔ اس کا نتیجہ مجھے زیادہ سے زیادہ اچھا حاصل ہو سکے گا۔ تو پھر تو تُو اس کام کے کرنے کی مجھے توفیق عطا فرما۔ اور اس کام کو اعلےٰ درجہ کی تکمیل تک پہنچانے کے لئے مجھے سہولت بخش۔ اور اس کے نتائج کو میرے لئے وسیع سے وسیع تر کر۔ اور اگر اس کے برخلاف تیرے علم میں یہ ہو کہ یہ کام میرے لئے مناسب نہیں۔ دین کے لحاظ سے یا دنیا کے لحاظ سے یا اس لحاظ سے کہ میری محنت کے مطابق اس سے نتیجہ پیدا نہ ہوگا۔ تو تو اس کام کے راستہ میں روکیں ڈالدے اور میرے دل میں بھی اس سے بے رغبتی پیدا کردے۔ اور اس کے سوا جس امر میں میرے لئے بہتری ہے اس کے سامان میرے لئے پیدا کردے اور اس کی طرف میری توجہ پھیر دے اور اس کی خواہش میرے دل میں پیدا کردے۔

یہ دعا کتنی کامل ہے۔ اور اس میں کس لطیف پیرایہ سے اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ہر اچھا کام ہر زمانہ اور ہر انسان کے لئے مفید نہیں ہوتا۔ بلکہ اچھے سے اچھا کام بھی بعض زمانوں میں اچھا نہیں رہتا اور اچھے سے اچھا کام بھی بعض قوموں اور بعض افراد کے لئے اچھا نہیں ہوتا۔ پس اپنی محنت کے اعلیٰ سے اعلیٰ پھل حاصل کرنے کے لئے انسان کو وہ کام اختیار کرنا چاہیئے جو اس کے لئے اور اس کی قوم کے لئے اور بنی نوع انسان کے لئے اس زمانہ میں مفید ہو اور جسے اعلیٰ طور پر بجا لانے کی اس میں ذاتی قابلیت موجود ہو اگر یہ نہ ہو تو اسے وہ کام یا علم کسی دوسرے بھائی کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور خود اپنے لئے اپنے مناسب حال کام یا علم تلاش کرنا چاہیئے۔ لیکن چونکہ بنی نوع انسان کی ترقی کا معاملہ انسانی جدّ وجہد اور اس کی دماغی قابلیتوں کے علاوہ خدا تعالےٰ کی صفات کے ظہور کے موجودالوقت مرکز کے ساتھ بھی وابستہ ہے اس لئے اسے کام شروع کرنے یا علم کی تحصیل کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے بھی یہ دُعا کرلینی چاہیئے۔ کہ اس زمانہ کے متعلق جو اس کی تجویز اور اس کا فیصلہ ہے وہ آسے اس کے مطابق عمل کرنے کی توفیق بخشے۔ تاکہ اچھا بیج اچھی زمین میں مناسب موسم میں پڑے۔ تا اعلیٰ سے اعلیٰ کھیتی پیدا ہو۔ اور زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو۔

اقتباس از خطاب بر موقعہ طلبہ تقسیم اسناد
(منعقدہ اپریل ۱۹۵۰ء)

قائد اعظم

ایک اور درخشاں باب

"آپ کو صرف اپنے آباؤ اجداد کی طرح مجاہدانہ جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے آپ اس قوم سے تعلق رکھتے ہیں جس کی تاریخ دلاوری۔ شجاعت اور کرداری اوصاف۔ کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ ان روایات کے مطابق زندگیاں بنائیے۔ اور اس تاریخ میں ایک اور درخشاں باب کا اضافہ کیجیئے۔"

(۳۰ / اکتوبر ۱۹۴۷ء)

الجھنیں

مطیع اللہ ذری

زندگی میں انسان بہت سے حادثات سے دوچار ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ حادثات بڑے ہولناک ثابت ہوتے ہیں اور انسان ان کے اثرات کو دور کرنے کی عرصہ دراز تک کوشش کرتا رہتا ہے تلخ حادثات کے برعکس معمولی اور موافق حادثے جلد ہی ماضی کی دھندوں میں کھو جاتے ہیں لیکن اول الذکر حوادث انسان کے دل پر ایک انمٹ نقش کی طرح ثبت ہو کر کبھی زندگی کو بے کیف و بے مزہ کر دیتے ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان ان حادثوں کے چکر سے زندگی بھر نکلنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اور اپنی الجھنوں کا شکار ہو کر ہمت ہار بیٹھتا ہے۔ ارشد بھی ایک اسی قسم کے حادثے سے زخمی ہوا اور آج تک شفایاب نہیں ہو سکا۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ارشد نے ملازمت اختیار کر لی۔ وہ ایک سکول میں مدرس کے طور پر ملازم ہو گیا۔ مگر مدرسی کے پیشے سے اسے سخت نفرت ہے اس کے باوجود وہ اسے چھوڑنے پر تیار نہیں ہیں جب بھی اس سے ملتا ہوں وہ اپنی ملازمت کے دکھڑے بیان کرنا شروع کر دیتا ہے کہ میرا سارا دن طالبعلموں سے مغز کھپانے میں صرف ہو جاتا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی ذہنی سکون میسر نہیں آتا۔ میں نے ارشد سے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ تم یہ ملازمت چھوڑ دو اور کسی ایسے پیشے کو اختیار کرو جو تمہاری طبیعت کے موافق ہو۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ راستہ تمہیں موافق نہیں تو کوئی اور راہ اختیار کر لو۔ جہاں تم کامیاب زندگی بسر کر سکو۔ لیکن ارشد کی حالت عجیب ہے۔ ملازمت سے نفرت، دماغی پریشانی اور مفلسی کا یہ عالم اس پر بھی وہ نیا راستہ اختیار کرنے سے ڈرتا ہے یہ اس کی تنگ نظری، پست ہمتی اور ذہنی جمود کی علامت ہے۔ اس کی بے کیف زندگی کو دیکھ کر میں اکثر سوچنے لگتا ہوں۔ کہ ہر انسان کی زندگی میں ایک ایسا خطرناک لمحہ آتا ہے جب اسے اپنے مستقبل کے بارے میں کسی مخصوص اور کارآمد راستے پر مڑ جانا ہوتا ہے اس موڑ کی ذراسی لغزش انسان کو عمر بھر کے لئے مجبوری اور بیچارگی کی زندگی کی طرف دھکیل سکتی ہے اور اگر یہ موڑ عقلمندی اور دور اندیشی سے طے کر لیا جائے تو انسان آرام و آسائش اور کامیاب زندگی حاصل کرنے میں تضیع اوقات سے بچ جاتا ہے۔ ارشد کی اسی چھوٹی سی لغزش نے آج اس کی زندگی کو اجیرن کر کے اسے ذہنی الجھنوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ارشد کی بے مزہ زندگی کو دیکھ کر مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ ہماری معاشرت کی اکثر خرابیوں کی باعث یہی لغزش تو نہیں؟

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ بھیڑ چال کی طرح ایک ہی سمت کو چل پڑتے ہیں۔ اندھا دھند تقلید کی عادت ہمارے ہاں عام پائی جاتی ہے۔ آسان راستہ دیکھ کر لوگوں کا جم غفیر اس طرف کو اُمڈ آتا ہے پھر وہاں اس قدر بھیڑ ہو جاتی ہے کہ ہر شخص خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

ایک راہ پر ہجوم ہونے کے باعث بہت سے امیدوار ناکامی سے دوچار ہو کر قسمت اور مقدر کو کوستے ہیں اپنی غلطی کو قسمت کی آڑ میں چھپا کر اپنی بریت کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ چاہیئے یہ کہ جس طرف لوگوں کی بھیڑ کم ہو اور جس راستہ کو عوام مشکل سمجھتے ہوں آپ اس راستہ پر چل کھڑے ہوں اور ایثار اور قربانی، مستقل مزاجی اور محنت سے اسے طے کریں۔ یقیناً آپ کامیابی کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنے اختیار کئے ہوئے راستے سے آپ کی طبیعت کی ہم آہنگی اور دلچسپی ہو۔ مقصد اگر ذوق کے مطابق ہو تو انسان بہت سی مشکلات سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔

ہمارے ہاں دیکھنے میں آیا ہے کہ طالب علم کا طبعی میلان تو شاعری یا کسی اور طرف ہے اور والدین اسے سائنس پڑھانے پر مُصر ہیں۔ اب نہ تو طالب علم کامیاب ہوتا ہے اور نہ والدین مطلق ایسی راہوں پر چل کر تضیع اوقات اور نقصان کے سوا کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ دراصل ہونا یہ چاہیئے کہ نوجوان کی ابتدائی تعلیم کے بعد اس کی طبیعت کی موزونیت کا اندازہ کر کے اسکے میلانِ طبع کے مطابق راہ کرنے کا اسے موقعہ دیا جائے۔

والدین کا کام نوجوان کو زندگی کے چوراہے پر لا کھڑا کرنا ہے آگے نوجوان کو خود اپنی عقل و دانش سے کام لیکر اپنے لئے

جادۂ حیات منتخب کرنا چاہیئے۔ اگر ایک راستہ اسے منزلِ مقصود تک نہیں لے جاتا تو اسے دوسرا طریق اختیار کرنا چاہیئے۔ ارشد اگر ایک کامیاب مدرس نہیں بن سکا۔ تو یہ اس کے مقدر یا قسمت کا نہیں بلکہ اس کا اپنا قصور ہے۔ کامیابی دوسری راہ پر اس کی منتظر ہے۔ اگر آج بھی وہ پرانی روش کو بدل کر نئی راہ پر چل کھڑا ہو۔ تو وہ یقیناً کامیاب ہو سکتا ہے۔ ایک ایسے راستے سے چمٹے رہنا جو طبیعت کے خلاف ہو کبھی انسان کو سکھ اور چین کا سانس نہ لینے دیگا۔ بلکہ راستہ کی مشکلات اور تکلیفیں اسے زیادہ ڈراؤنی اور مشکل معلوم ہوں گی۔ اس کے برعکس اگر اس کے اختیار کردہ راستے سے دلچسپی اور طبعی میلان کی ہم آہنگی ہو تو رکاوٹیں اور تکلیفیں آسان دکھائی دیتی ہیں۔ اور انسان ہنستا کھیلتا انہیں عبور کرتا چلا جاتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں اَن گنت لوگ ایسے ہیں جو اپنی زندگی سے اُکتا چکے ہیں کسی ایسے ہی دل برداشتہ شاعر نے کہا ہے۔ ع

زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

ہماری قوم کے بیشتر افراد کی زندگیاں محض مشین کے ایک چکر کی طرح چل رہی ہیں۔ بے جان اور افسردہ۔ وہ بمشکل اپنی روٹی کما سکتے ہیں۔ ان کی منزلِ مقصود کوئی ہے ہی نہیں۔ وہ اَن جانی پگڈنڈیوں پر بھٹکتے ہوئے زندگی کا یہ طویل سفر طے کئے جاتے ہیں۔ گویا اپنی زندگی ان کے اختیار میں نہیں۔ بلکہ وہ زندگی کے ہاتھوں بے بس ہیں۔

عام طور پر کسی سے بات کی جائے تو وہ حالات کی شکایت کرتا ہے۔ بہت ممکن ہے حالات بھی انسان کی ناکامی کا باعث ہوں مگر اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر بہنے کے لئے چھوڑ دینا کم ہمتی نہیں تو اور کیا ہے۔

اصل میں حیات کے نشیب و فراز کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہوئے جو لوگ سفر کرتے ہیں وہ شاذ و نادر ہی حوادثِ زندگی پر غالب آتے ہیں۔ اکثر یہی دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ ایسے لوگ زندگی کے پیچوں ہی میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ موجودہ دور میں ہر راہ رو منزل ماضی پہ ماتم کناں اور مستقبل سے بے پرواہ حال کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے دل میں حصولِ مقصد کا مضبوط ارادہ اور مستقل مزاجی سے محنت کرنے کا عزم ہو۔ انسانی کردار میں ارادہ کی مضبوطی کامیابی کی ضامن ہے ہماری اکثر و بیشتر کوششیں صرف اس وجہ سے ناکام ہو جاتی ہیں۔ کہ ہم ان کے لئے ابتدا سے اختتام تک ضروری محنت نہیں کرتے اپنی زندگی کی کوششوں اور محنتوں کے ماحصل پر غور و فکر نہیں کرتے۔ اور مناسب تدابیر اور طریقوں کو نہیں اپناتے جو ہمیں مقصدِ حیات تک لے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ محنتی آدمی بھی بعض اوقات ناکام ہو جاتا ہے لیکن اسے کیا ڈر! کیونکہ محنتی انسان ناکامیوں کے سائے میں نئے نئے تجربات حاصل کرتا ہوا زیادہ سمجھدار اور تجربہ کار ہوتا چلا جاتا ہے۔ آخر ایک دن وہ اپنے گوہرِ مقصود کو حاصل کر لیتا ہے۔ حقیقت میں مستقل مزاجوں کی شکستیں منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے راستے میں مختلف قیام گاہیں ہیں۔ جہاں وہ کچھ دقفے کے لئے ستانے کے بعد منزل کی جانب چل پڑتے ہیں۔

قاصد ظریف

نذرِ غالب

مانا کہ تیری یاد تو دل سے اُتر گئی
تسکینِ اضطراب کی صورت مگر گئی

کیا جانے کیا سُنا کے نسیمِ سحر گئی
پھولوں کی آنکھ اشکِ ندامت سے بھر گئی

دل کو بنا کے خوگرِ لطفِ جمالِ دوست
وہ چشمِ التفات نہ جانے کدھر گئی

تم تھے تو گھر تھا رونقِ صد حسن و کائنات
تم کیا گئے کہ رونقِ دیوار و در گئی

قاصد اٹھی چمن سے جو موجِ ہوائے گل
اہلِ جنوں کو اور بھی دیوانہ کر گئی

سمیع اللہ قریشی

عینک کے بغیر

جی عینک کے بغیر یہ خاکسار کچھ بھی نہیں۔ ابھی چہرے سے ہٹاتی تو دنیا اندھیر ہو گئی۔ ابھی ناک پر جاتی تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ بس یوں سمجھئے کہ اب تو عینک بھی جیسے جسم کا ایک حصہ اور لازمی جزو بن چکی ہے۔ کیا عرض کروں۔ پچھلے دنوں یونہی عینک صاف کرتے ہوئے اچانک اس کی ایک کمانی ٹوٹ گئی۔ کمانی کیا ٹوٹی قسمت پھوٹ گئی اور مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ بھلا ایک کمانی کے بغیر عینک ناک کے بانسے پر کیوں کر ٹکنے لگی۔ ہولے سے لگاتی اور ذرا جو ادھر منہ پھیرا تو عینک کو جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ ایسے موقعوں پر عموماً ایک ہاتھ سے عینک سنبھالنا پڑتی۔ اور دایاں ہاتھ تو اس بات کا منتظر رہنے لگا۔ کہ کب عینک گرے اور میں اسے اس اقدامِ خودکشی سے روکوں۔

ایک روز کی بات ہے میں ایک ہاتھ کان پر رکھے عینک سنبھال رہا تھا اور دوسرے ہاتھ میں شاید کوئی چیز اٹھا رکھی تھی، کہ ایک بزرگوار . . . . . . میرے قریب آ کر ہولے سے فرمانے لگے! "میاں! کوئی تکلیف ہے کیا کان میں"؟ میں نے حیران ہو کر کہا۔ "نہیں" "کہنے لگے "پھر یہ اپنا کان کیوں دبا رکھا ہے"؟ میں نے ہنس کر اپنی ٹوٹی عینک سے ان کا تعارف کرایا تو کہنے لگے "حد ہو گئی میاں تمہاری عقل کی۔ بھلا اس میں کونسی مشکل ہے کمانی ٹوٹ گئی ہے تو دھاگہ باندھ لو"۔ دراصل اس بات کا مجھے خیال ہی نہ آیا تھا۔ میں تو یہی سمجھے ہوئے تھا کہ اس زہر کا شاید اور کوئی تریاق ہی نہیں۔ سوائے اس کے کہ دو ڈیڑھ روپے کی قربانی کروں۔ جو اس وقت میرے پاس نہیں تھے۔ کہ نئی کمانی لگوا سکوں۔

بہرحال صاحب میں نے ٹوٹی ہوئی کمانی کی جگہ دھاگہ باندھ تو لیا۔ لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ ایسا کرنے سے پہلے علم ہندسہ سے واقفیت ازحد ضروری ہے اور میں اس علم میں کورا واقع ہوا ہوں پہلی دفعہ اس نئے تجربہ کو جو آزمایا تو معلوم ہوا۔ کہ دونوں شیشے الگ الگ زاویہ ہائے نگاہ بنا رہے ہیں چاہیئے تو یہ تھا کہ دونوں شیشے خطِ استوا . . . . نہ میرا مطلب ہے خطِ مستقیم پر واقع ہوتے۔ لیکن صورتِ حال یہ تھی۔ کہ ایک شیشہ تو کچھ غنیمت تھا لیکن دوسرا بڑی شد و مد سے خطِ سرطان کو چھونے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ بڑی کوشش سے دونوں شیشے ایک سیدھ میں لائے گئے لیکن عینک کی حالت پھر بھی زبوں ہی تھی۔

انہی دنوں کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی صبح کا ذکر ہے۔ دھوپ سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہم چند دوست کالج لان میں بیٹھے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے موضوعِ بحث میری ٹوٹی ہوئی کمانی ہی تھی۔ کہ ایک زندہ دل ظالم دبے پاؤں پیچھے سے آئے اور چپکے سے "سیون او کلاک" کے ساتھ کمانی کا بدل کاٹ دیا۔ واقعہ بالکل غیر متوقع تھا۔ اس لئے حادثہ بن کر رہ گیا۔ عینک کٹ سے سامنے پڑی ہوئی اینٹ پر گری اور گرتے ہی شہید ہو گئی۔ فریم درمیان سے ٹوٹ گیا۔ دونوں شیشے کرچی کرچی ہو چکے تھے میں نے بھرائی ہوئی آواز سے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھا۔ باقی دوستوں نے کچھ اس انداز سے کلمۂ شہادت پڑھا جیسے کسی لاوارث کے جنازے کو کندھا دے رہے ہوں۔ واقعہ حسرتناک تھا ایک شاعر دوست وحید صاحب تو کچھ اس طرح متأثر ہوئے کہ فی البدیہہ ایک مرثیہ تصنیف فرما دیا۔ فرماتے ہیں:۔

ایک سُرخ عینک — کہ جس کے شیشے
پائے تھے ہم نے — "گاگل" نگر سے
بیٹھے بٹھائے — یوں ٹوٹ جائے
اپنی تو قسمت — ہی پھوٹ جائے
پر تعزیت کو
کوئی نہ آئے

چلئے کمانی ٹوٹ گئی تھی شیشے تو سلامت تھے کام تو کسی نہ کسی طرح نکل ہی رہا تھا۔ لیکن اب تو نہ کمانی تھی نہ شیشے — اس وقت

مجھے اپنی بے کسی پر سخت رونا آیا۔ بارہا جی چاہا کہ سر میں دو ہتڑ مار مار کر عینک کا ماتم کروں لیکن آخر صبر کرتے ہی بنی۔

اور یوں عینک کے داغ مفارقت دے جانے کے بعد جن جن حادثات سے مجھے دوچار ہونا پڑا وہ میں ہی جانتا ہوں۔ پرسوں ذرا لاٹ صاحب کے دفتر تک جانے کے لئے بس کا انتظار کر رہا تھا۔ خدا خدا کر کے بس آئی۔ میں نے اس کا نمبر پڑھنا چاہا لیکن کچھ دکھائی نہ دیتا تھا میں نے بہتیرا دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر بے سود۔ ایک دھندلا سا ہندسہ تھا جس پر ایک سے لیکر نو تک مختلف ہندسوں کا دھوکہ ہو رہا تھا۔ سوچا آخر کہیں تو جائے گی ہی نا۔ اس لئے بیٹھ گیا لیکن اگلے ہی موڑ پر جب بس کسی دوسری سڑک کی طرف مڑ گئی تو پتہ چلا کہ یہ تو لنڈے بازار کو جا رہی ہے مجبوراً اترنا پڑا۔ لیکن کنڈکٹر کا یہ فقرہ اب بھی یاد ہے "بس کا نمبر بھی نہ پڑھ سکے تھے"۔

واپسی پر میں نے پیدل ہی چلنا مناسب سمجھا۔ یونہی چلا جا رہا تھا کہ ایک ٹال پگڑی والے نے ٹوکا "بابو جی فٹ پاتھ پر چلئے سڑک پر چلو گے تو کوئی موٹر لاری کچل دے گی۔ اندھے ہو گیا!" گھبرا کر دیکھا تو اپنے آپ کو بیچ سڑک کے ٹہلتے پایا۔ خفت چھپانے کے لئے ناک صاف کرتے ہوئے فٹ پاتھ ڈھونڈا۔ اور گھر پہنچا۔ لیکن راستے میں کئی شریف آدمیوں سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

کل شام امیرو پان والے کی دوکان پر کھڑا دیہاتی پروگرام سن رہا تھا۔ کہ ایک راہگیر نے وقت پوچھ لیا۔ امیرو کا ٹائم پیس میرے سامنے کوئی ڈھائی گز کے فاصلے پر ہو گا۔ لیکن مجھے اس کے ڈائل کی سفیدی کے سوا کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ قریب سے وقت دیکھنے کے لئے آگے بڑھا تو اپنے ہی کمبل میں پیر جو الجھا اور میں کھٹاک سے سوڈے واٹر کی بوتلوں پر گرا۔ وہی راہگیر بیچارا اٹھانے کو دوڑا۔ دو تین بار شوں شوں کر کے منہ سے کف نکال کر اپنے شدید غم و غصہ کا اظہار کر رہی تھیں۔ پانوں کی تھالی زمین بوس ہو چکی تھی۔ اور امیرو دانتوں تلے انگلی دبائے حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ راہگیر بڑبڑاتا ہوا اپنی راہ ہو لیا۔ شاید کہہ رہا تھا کہ "مجھے وقت کیا بتاؤ گے اپنی ہوش سنبھالو"۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی تو امیرو زیر لب ہنستے ہوئے کہنے لگا "عینک کب کی ٹوٹ گئی بابو جی" میں کھسیانہ سا ہو کر چلا آیا۔

اترسوں محض عینک کے نہ ہونے کی وجہ سے ایک محترمہ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ وہ تو خواہ مخواہ الجھ رہی تھیں۔ میں چندیا کی خیر مناتے ہوئے کھسک آیا۔ کالج میں پروفیسر صاحب نے بلیک بورڈ پر لکھے ہوئے کسی لفظ کا مطلب پوچھا۔ مجھے نظر نہ آ رہا تھا اس لئے "آئی ڈونٹ نو سر" کہکر چپکا ہو رہا۔ ان پر بھی بیڈ امپریشن پڑا ہو گا کہنے لگے "آپ کو اتنے آسان لفظ کے معنے بھی نہیں آتے"۔ شاید انہیں خیال نہیں رہا کہ میری عینک ٹوٹ چکی ہے۔

بہرحال اتنی شکستوں کے بعد میں نے مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ خواہ کچھ ہو صبح قرض لیکر بھی نئی عینک لگوا لوں گا۔ کل دوپہر کے وقت نیلے گنبد کے پاس آپ نے مجھے آواز دے کر بلایا۔ تو آپ کو پہچانا اور نہ میں تو چپکے سے آگے نکل چلا تھا۔ آپ نے شاید اسے ناراضگی پر محمول کیا ہو۔ لیکن صاحب دراصل یہ میرا قصور نہ تھا قصور میری آنکھوں کا تھا۔ یا پھر اس لنگڑی عینک کا جو آج چھ روز ہوئے قبرستان میانی کے ایک گوشے میں آرام کی میٹھی نیند سو رہی ہے۔ خدا کسی کی نظر کمزور نہ کرے۔ آپ کی آواز پر قریب پہنچ کر آپ کی صورت پہچانی۔ آپ نے اس بے التفاتی کا گلہ بھی کیا تھا۔ اس وقت تو میں نے ایک بہانے سے آپ کو ٹال دیا تھا اصل رام کہانی اب گوش گزار کر رہا ہوں۔ نئی عینک ابھی ابھی خرید کر کے لا رہا ہوں۔ امید ہے آپ معاف فرمائیں گے۔

بقیہ صفحہ ۱۰

مسرتوں کے خیال کو دل سے نکال دے۔ میں تیری رحمت میں سرشار ہو کر باقی زندگی گذار دوں۔ اور دنیا کی بڑی سے بڑی خوشی بھی تیری عبادت کے راستے میں روک نہ بنے۔ اے خدا! مجھے دھتکار نہیں کہ اس دکھے دل کا تیرے سوا کوئی نہیں۔

وہ دیر تک سجدہ میں پڑا رو رو کر خدا کے حضور دعا کرتا رہا جب نماز پڑھکر اٹھا تو اس کا دل مطمئن تھا بیقراری کی بے پناہ موجیں ساکن ہو چکی تھیں۔ دماغی خلفشار مٹ کر سکون کا دور دورہ تھا۔ وہ مندرجہ ذیل شعر گنگناتا ہوا کھانا کھانے چلا گیا۔

بروز حشر مجھے اس کی شرم ہے احساںؔ
بقدر رحمت یزداں گناہ کر نہ سکا

سمیع اللہ قریشی

واردات

وسعتوں سے گذرتے رہے قافلے
رہگذاروں میں چلتے رہے کارواں
کوئی مل نہ سکا منزلوں کا نشاں
دھول اُڑتی رہی
بھورے ٹیلوں کے ذرّے چمکتے رہے
سامنے دُور ان پربتوں سے پرے
دل کی ٹھہری ہوئی جھیل کے دائرے
جال بُنتے رہے۔
عشق پیچاں کی الجھی ہوئی چلمنیں
زندگی کے کھنڈر پر لٹکتی رہیں
لیکن اس پر بھی کلیاں لہکتی رہیں
پھول کھلتے رہے۔
شام کے سرمئی دھندلکے چھا گئے
یوں اُبھرنے لگے لوحِ احساس پر
چند رنگین لمحات جن کا اثر
دل سے مٹ نہ سکا
کوئی کونج اپنی مجروح آواز میں
مرثیے ماتمی گیت گاتی رہی
اپنے ٹوٹے سے پر پھڑپھڑاتی رہی
جانے کس لئے
دور کھیتوں میں خمدار پگڈنڈیاں
مجھ کو کچھ دیر اُٹھ اُٹھ کے تکتی رہیں
مجھ پہ یونہی اشارہ دل میں ہنستی رہیں
اور پھر چھپ گئیں
میری پلکوں میں آنسو لرزتے رہے
میرے انفاس آہوں میں ڈھلتے رہے
میرے ارمان یونہی مچلتے رہے
کوئی آ نہ سکا

• —— •

محمود شیرانی

تصوّراتِ محمودؔ

جب سحر کی طلعتوں سے پردۂ شب چاک تھا
جب سیاہی سے بلند و پستِ عالم پاک تھا
کھیلتی تھی ہر کلی پر اوس جب بن کر حباب
حسن کی کیفیتوں میں غرق تھی جب کائنات
نغمہ زن تھا ہر طرف گلشن پہ جب ہلکا سا نُور
چھن رہا تھا آسماں سے ایک وجد آور سرور
کونپلوں کو چیرتی ٹھنڈی ہوا آتی تھی جب
زندگی میں زندگی کی لہر دوڑاتی تھی جب
یک بیک آیا نظر یوں ماہ پاروں کا ہجوم
جس طرح شاداب راتوں میں ستاروں کا ہجوم
ارغوانی آنچلوں میں ان کے چہرے نور پاش
گہرے گہرے بادلوں میں بجلیوں کا ارتعاش
صحنِ گلشن میں اداؤں سے قدم دھرتے ہوئے
صحنِ گلشن کو حریفِ تختِ جم کرتے ہوئے
دے گئے عہدِ گذشتہ کا وہ پیغامِ جمیل
کھیلتی تھی جس کی رعنائی سے موجِ سلسبیل
وہ حسیں منظر وہ نغمے یاد کر لیتا ہوں میں
دل کی دنیا اس طرح آباد کر لیتا ہوں میں

مطیع اللہ درد

احساسِ معصیّت

وہ آج خلافِ معمول غم کی لرزہ خیز گہرائیوں میں اپنے المناک تصور کے ساتھ سرد آہیں بھرتا ہوا واپس گھر آیا۔ نڈھال اور مضمحل سا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ زندگی کی مانوس آوازوں سے بے پرواہ بے سُدھ سا چارپائی پر لیٹ کر کسی گہری سوچ میں کھو گیا۔ اس کا دل غیر معمولی جوش دکھا رہا تھا۔ وہ بے چینی اور بے قراری سے پہلو بدل بدل کر سو جانا چاہتا تھا مگر نیند اس سے کوسوں دُور تھی۔ وہ دن بھر بجد بے چین رہا تھا۔ اور اس وقت سونے کی سعیٔ رائیگاں میں مصروف تھا کہ اتنے میں مغرب کی اذان کی دلکش اور روح افزا آواز سنائی دی۔ اور وہ اس کے دلآویز اور خوش کن ترنّم سے محظوظ ہونے لگا۔

اچانک اس کے دل میں ایک خیال آیا۔ اور وہ اُٹھا۔ اندھیرے میں امید کی کرن نکلتے دیکھ کر بے اختیار ہو گیا۔ اور غیر ارادی طور پہ وضو کرنے کے بعد مغرب کی نماز میں اپنے مکمل تزین انہماک تخیل کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ دل بھر کے رو دیا اور یہ دعا کی: "اے غفور الرحیم خدا! ایک گنہگار بندہ بارگاہِ ایزدی میں بارِ گناہ لئے ہوئے جھکتا ہے اس کا دل عبودیّت کے انتہائی جذبات سے لبریز اور اس کی آنکھیں اشکِ ندامت سے چھلک رہی ہیں وہ بصد عجز و نیاز سرکارِ عالی میں ملتجی ہے۔ کہ تو اس کے اس اعترافِ قصور کو اپنی رحمت کی چادر میں چھپا لے اس کا دل تیری بخشش کے حصول کے لئے بری طرح مچل رہا ہے۔ تو اسے سکون و اطمینان کی دولت سے مالا مال کر دے۔

میرے مالک! میں نے دنیوی لذّتوں کو حاصل کرنے کے لئے بڑے جتن کئے دنیا کے لوگوں سے محبت و اخلاص، ایثار و قربانی اور سچائی کے جذبات کا اظہار کر کے اپنی دنیا کو عارضی مسرتوں سے شاداب کرنا چاہا۔ مگر ہر چہار طرف سے اسے ناکامی و نامرادی کی پیہم تلخیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ آج ایک لمبے تجربے کے بعد مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا بنی نوعِ انسان سے آجکل خوش کن امیدیں وابستہ کرنا ایک ایسی غلطی ہے۔ جو ایک معصوم و نازک دل کو دائمی خلفشار سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ میں اس غلطی کا مرتکب ہوا مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ایسے انسانوں سے سنہری امیدیں وابستہ کیں۔ جو کہتے تھے۔ ع

"اک شوقِ تمنّا ہے سو ہم کرتے رہیں گے"

اس کی وجہ سے آج میری زندگی ناقابلِ برداشت حد تک تلخ ہو چکی ہے ہر وقت کی بے چینی و بے قراری مجھے جینے سے عاجز کر دی ہے میں نے ہر ممکن طریق سے مسرت و انبساط کی تلاش کی۔ مگر چند لمحوں کی خوشی کے بعد میری قسمت مجھے رنج و الم، بے رُخی، سرد مہری بیوفائی اور بے اعتنائی سے دوچار کرتی رہی۔ آج میرا دل دُنیا کے اس سرد رویہ کی وجہ سے خون کے آنسو رو رہا ہے۔ میرا سینہ زخموں سے چور ہے میرا ضمیر بیدار ہو کر مجھے کچوکے لگا رہا ہے۔ کہ او رذالے دنیا کا۔ سراب کو شراب سمجھ کر بھاگا پھر کیا تو جانتا نہ تھا کہ اصل محبت اور احترام کے قابل صرف خدائے قدوس کی ذات ہے حقیقی سکونِ نفس اور اطمینانِ قلب صرف اسی کی عبادت میں مل سکتا ہے۔ آج میرا دل بُری طرح نادم ہے۔ میں تیرے حضور التجا کرتا ہوں کہ تو میرے گناہوں کو بخش۔ اے مسکین نواز! تیری رحمت تو میری وسعتِ خیال سے بھی زیادہ ہے۔ تو مجھے اپنی آغوشِ رحمت میں جگہ دے۔ میرے اللہ! میرا دل جو عرصہ تک دُنیا کے پیچھے لگا رہا۔ آج تیری محبت کا جذبہ شدید طور پر محسوس کر رہا ہے تو اس کے دل سے دنیوی خواہشات کو بالکل مٹا دے اور ان کی بجائے اپنے عشق اور محبت کے عمیق جذبات سے اسے پُر کر دے۔ میرا دل دنیا کے لئے بالکل سرد کر دے۔ اور

غیر کے آگے مت جھکا میرے کریم تا ابد

اپنے سوا ہر ایک سے مجھ کو تو بے نیاز کر

میرے معبود! مجھے امید کامل ہے کہ ایک بھکاری تیری درگاہ سے ٹھکرایا نہ جائے گا۔ میں جانتا ہوں دردمندوں کا سہارا صرف تیری رحمت کی آغوش ہے مجھے اس میں جگہ دے۔ دنیا اور اس کی

محمد ذکریا طاہر

یہ انسان کہاں ہیں؟

اب دینِ محمد کے نگہبان کہاں ہیں
مذہب پہ جو قائم ہوں مسلمان کہاں ہیں؟
جو احمدِ مرسل کے لئے جان لڑا دیں،
دیں داد شجاعت کی، وہ سلطان کہاں ہیں؟
تلواروں کے سائے میں جو پڑھتے ہوں نمازیں
وہ لشکرِ احمد کے نگہبان کہاں ہیں؟
جو حق کے لئے قوتِ باطل سے نہ لرزیں
آئیں تو ذرا حافظِ قرآن کہاں ہیں؟
جو لوگ مئے عشقِ محمد سے تھے مخمور!
اسلام کے وارث وہ مسلمان کہاں ہیں؟
جن میں نہ عداوت نہ حسد بغض و کدورت
آ ہم کو بتا جا کہ وہ انسان کہاں ہیں؟

طاہر یہی حسرت ہے کہ ہم لوگ بھی دیکھیں
دنیا میں یہ قرآں کے نگہبان کہاں ہیں؟

سجاد ظہیر سبّ،

"گل"

موسمِ گل کی ہوائیں یہ کئی بار اسی شاخ پہ جھوما ہوگا!
موسمِ گل کی ہوا نے اسے کس پیار سے چوما ہوگا!
موسمِ گل کی ہوا
کب کی مگر جا بھی چکی!
سینکڑوں بار اسی پتے پہ شبنم کی پری
رقص کرتی ہوئی آئی ہوگی۔
سینکڑوں بار یہ برسات کی بوندوں میں نہایا ہوگا!
لیکن اب سوکھی ہوئی شاخ پہ خاموش ہے یہ،
کب تلک تیز ہواؤں کے تھپیڑوں کو سہے گا تنہا!
کب تلک ایسے رہے گا تنہا!
شام آئے گی تو بے درد ہوائیں آکر
ایک ہی پل میں مٹا ڈالیں گی
آخری عہدِ بہاراں کا یہ خاموش نشاں!

★

جمیل احمد خاں

گل و خار

راہ کے کانٹوں سے ڈر کر اپنی منزل کو نہ بھول ٭ کوئی تجھ کو دے رہا ہے دور سے آواز دیکھ!

منزل اور کانٹا تشریح طلب نہ سہی توصیف طلب ضرور ہیں مختلف نظریات، مختلف زاویے۔ کون کہے کون سیدھے راستہ پر ہے اور کون غلط پر۔ میرے نزدیک بس یوں سمجھ لیجئے۔ کہ اگر لاہور ایک منزل ہے تو اس کی پُرپیچ اور متعفن گلیاں کانٹے۔ اگر مجھ پر اعتبار نہیں تو کسی اور منچلے طالبعلم سے پوچھ لیجئے۔ کہ جب بھیگی رات میں وہ منزل پر پہونچنے کے لئے ایک تان "مُرے بلم آجا" کی لگاتا ہے۔ تو حکومت کی زنجیریں خار بن کر اسے چبھتی ہیں اور پھر نہ منزل باقی رہتی ہے اور نہ کانٹا۔ یہ تو ہے فکرِ انسانی جو کبھی غم سے آبدیدہ ہو کر موّاج سمندر کی تہوں میں موتی تلاش کرتا ہے اور کبھی خوشی سے پھولے نہ سما کر چاند ستاروں کو کسی بدبخت کے آنسوؤں سے تشبیہہ دیتا ہے۔

سنتے ہیں کسی زمانے میں جب لوگ پیدل سفر کیا کرتے تھے۔ منزل پر پہونچنے کے لئے انہیں دو عدد ٹانگوں اور تھوڑی سی عقل کی بھی ضرورت ہوتی تھی۔ اور پھر کمر ہمت باندھی۔ منزل کو دل سے لگایا اور خاروں کو دیکھتے ہوئے چل دیئے۔ مرہم پٹی تو منزل پر پہنچنے کے بعد ہی ہوا کرتی تھی۔ لیکن آج نہ وہ منزل ہے اور نہ کانٹے۔ نہ وہ عزم اور رنج جفاکشی اس گیس اور بھاپ کے دور میں اس کی چنداں ضرورت نہیں رہی یہاں تو اب مرہم پٹی پہلے ہو جاتی ہے اور منزل کا ٹکٹ بعد میں لیا جاتا ہے یہ اور بات ہے کہ جگہ حاصل کرنے کے لئے آپ کو آستین چڑھانا پڑے چنانچہ اس ترقی یافتہ زمانہ میں منزل طے کرنے کے لئے صرف دو عدد جوتوں اور چند عدد کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر خار اور کانٹے خود ہی راستہ چھوڑ کر دُم دبائے بھاگ جاتے ہیں۔ یا پھر ریل اور ہوائی جہاز تک ان بیچاروں کا گذر ہی نہیں ہوتا۔ رو دیئے ان کی قسمت پر اور ہنسیئے اپنی عقل پر کہ اب عزم اور منزل کی حقیقت کس قدر تبدیل ہو چکی ہے۔

منزل ڈھونڈنے کے لئے کچھ اتنی زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں ذرا طبیعت میں ہیجان پیدا کیجئے۔ اور ہر بات میں بے چینی۔ نظروں میں دلکشی خود بخود آجائے گی۔ اور پھر ہر طرف منزل ہی منزل ہے جو راستہ چاہے اختیار کر لیجئے جس سمت دل چاہے جائیے لیکن ذرا نوکدار کانٹوں سے احتیاط لازم ہے کیونکہ یہ اکثر دامن پکڑ لیتے ہیں۔ جس طرح پھول بغیر کانٹے کے نہیں پائے جاتے بالکل اسی طرح منزل بغیر صعوبت اور تکلیف کے وجود نہیں رکھتی۔ ذرا عزم اور ہمت بلند رکھیئے اور "جہاں ڈوبے سفینہ ہم وہیں ساحل سمجھتے ہیں" پر کاربند رہیئے۔ پھر منزل آپ ہی کی ہے۔ منزل کے ہنستے کھیلتے لہلہاتے باغ آپ کی نظروں میں رقص کرنے لگیں گے۔ سکون شعار نسیم آپ سے اٹھکیلیاں کرے گی۔ کانوں میں کامیابی کی سریلی آوازیں آنا شروع ہو جائیں گی۔ کانٹے آپ پر ہنسیں گے قہقہہ لگائیں گے لیکن یاد رکھیئے آپ کی ذرا سی بے ہمتی آپ کو پھر اسی جگہ پر پہنچا دے گی جہاں سے آپ چلے تھے۔

دنیا ایک منزل ہے اور اس کی تمام آرزوئیں کانٹا۔ اسی منزل میں شاعر اپنے درد کا اظہار کرتا ہے ادیب اپنے غم کا افسانہ لکھتا ہے۔ غریب روٹی کے غم میں مجبوراً آنسو بہاتا ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے روتا ہے۔ گرتا ہے۔ ٹھوکریں کھاتا ہے ان تمام تکالیف کے باوجود وہ اپنی منزل نہیں بھولتا۔ کوشش کئے جاتا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ ایک توانا اور تندرست انسان بن جاتا ہے۔ چاند مسافرت کے لئے نکلتا ہے گہن کے ظالم ہاتھ کبھی کبھی اس کو تاریکی کے عمیق غار میں دھکیل دیتے ہیں لیکن پھر بھی وہ منزل کو اپنی ضیابار نگاہوں میں لئے ہوئے وادیوں کانٹوں اور گلستانوں پر دلکشی نچھاور کرتا ہوا اپنی منزل حاصل کر ہی لیتا ہے۔ دریا۔ پتھروں اور زمین کی سختی کے مظالم اٹھاتے ہوئے نکلتے ہیں۔ راستہ میں لاکھوں دیواریں اور روڑے حائل ہوتے پر بھی راستہ بنا ہی لیتے ہیں۔ گویا کہ فطرت کی ودیعت کردہ نعمتوں میں سب سے افضل منزل ہے۔

ہو سکتا ہے باد صرصر کے تیز و تند جھونکے۔ موجوں کے خطرناک حوادث اسے منزل تک نہ پہنچنے دیں۔ چراغِ زندگی راستے ہی میں گل ہو جائے۔ عناصر کی ترتیب منتشر ہو کر انہیں میں گم ہو جائے۔ مگر اُس کا

تمنائیں محض خیال بن کر رہ جائیں۔ مگر اس کا لطف پوچھئے۔ ان لوگوں سے جنہوں نے منزل کی جستجو میں خاک چھانی ہو۔ درحقیقت منزل کا خیال بھی ایک سکون اور منزل ہے۔ ایسا سکون جس میں زخم۔ حوادث۔ طوفان اور درد مداخلت نہیں کر سکتے۔ اور نہ اُن کی وہاں تک رسائی ہی ہو سکتی ہے۔ ایک منزل کا متلاشی جب مجبور اور بے حس ہو کر تھک کے لیٹتا ہے۔ تو لرزتی ہوئی آوازیں یکلخت یہ الفاظ اس کی زبان سے نکلتے ہیں۔ ؎

خیالِ منزلِ مقصود خوب ہے لیکن
وہ کیا کرے جو تری رہگذر میں کھو جائے

بے پایاں مجبوریوں۔ تصورات اور خیالات کے ساتھ منزل کا ایک مسرت افزا جھونکا۔ تمام زخموں پہ مرہم رکھ دیتا ہے۔ کبھی فردوس کی سیر کراتا ہے کبھی منزل کی آغوش میں دے دیتا ہے اور کبھی منزل صرف چند قدموں کے فاصلے پر دکھاتا ہے۔ آنکھیں بند کئے ہوئے درد و غم سے بالکل بے نیاز ہو کر، بدمست و سرشار یہ اُسے کھینچتا ہے لپٹتا ہے اور پیار کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ منزل کی راہ میں کانٹے ہوتے کیوں ہیں؟ کسی سائنسدان سے پوچھئے تو وہ مادّے پر بحث کریگا۔ کسی فلاسفر سے پوچھئے تو وہ کمال خواہش اس کی وجہ ٹھہرائے گا۔ کوئی کچھ کہے گا کوئی کچھ۔ مانئے یا نہ مانئے یہ آپ کا کام ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ دُنیا کی ہر چیز اپنے تضاد کی مرہونِ منّت ہے۔ اگر رات نہ ہوتی تو دن کو کون جانتا۔ اگر جھوٹ نہ ہوتا تو سچ کی قدر نہ ہوتی۔ اور اگر خار نہ ہوتے تو منزل میں سرور و کیف نہ ہوتا۔ وجہ کچھ بھی ہو ہم کو تو اس ہستی کا احسان مند اور شکر گزار ہونا چاہیئے۔ جس نے منزل کی راہ میں کانٹے بکھیر کر ہم کو غم کے ساتھ ان مسرتوں سے لطف اندوز کیا۔

قائدِ اعظم کا ارشادِ گرامی

"میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اُسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلامؐ نے ہمارے لئے بنایا ہے۔ ہمیں چاہیئے۔ کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصوّرات اور اصولوں پر رکھیں۔"

(۱۴ر فروری ۴۷ء)

(حضرت میرزا بشیر الدین محمود احمد ایدہ اللہ تعالےٰ)

سچے مسلمان کیلئے غیرت کا مقام

کمیونزم نظام میں وہ شخص جس کے پیروں کی مَیل کے برابر بھی ہم دنیا کے بڑے سے بڑے بادشاہ کو نہیں سمجھتے۔ جس کے لئے ہم میں سے ہر شخص اپنی جان کو قربان کرنا اپنی انتہائی خوش بختی اور سعادت سمجھتا ہے یعنی حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم۔ جو رات دن خدا کی باتیں سُنا کر بنی نوع انسان کی رُوح کو روشن کیا کرتے تھے اسی طرح مسیحؑ۔ موسیٰؑ۔ ابراہیمؑ.... یہ سب نعوذ باللہ نکمّے اور قوم پر بار تھے.... کمیونسٹ نظام تصویر بنانے کو کام قرار دیتا ہے وہ اسٹیچو بنانے کو کام قرار دیتا ہے مگر رُوح کی اصلاح کو کوئی کام قرار نہیں دیتا بلکہ اسے نکمّاپن سمجھتا ہے... میں دوسری دنیا کو نہیں جانتا مگر میں اپنے متعلق یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ نظام جس میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جگہ نہیں، خدا کی قسم اس میں میری بھی جگہ نہیں ہم اسی ملک کو اپنا ملک اور اسی نظام کو اپنا نظام سمجھتے ہیں جس میں ان لوگوں کو پہلے جگہ ملے اور بعد میں ہمیں جگہ ملے۔ وہ ملک اگر محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے بند ہے۔ تو یقیناً ہر سچے مسلمان کے لئے بھی بند ہے۔"

(اسلام کا اقتصادی نظام ص۶۸ تا ۷۰)

تکلفی

دیکھتا چلا گیا

پانچ نومبر کی روشن رات کے ساڑھے سات بجنے کو تھے۔ یونیورسٹی ہال کے اندر کالجوں کے لاؤبالی طلباء۔ سرکاری ملازمین ریٹائرڈ افسران اور شاعر درجہ وار بیٹھے پہلو بدل رہے تھے۔ باہر کاروں کے ڈرائیور۔ پولیس کے چوکس سپاہی۔ کرایہ پر سائیکل رکھنے والے اور یونیورسٹی گیٹ کے رکھوالے ہر نئے آنے والے کو شاعر یا کسی بم پھینکنے والی پارٹی کا رکن سمجھ کر اس بری طرح گھور رہے تھے۔ کہ ان کی جبینیں عرقِ ندامت سے آلودہ ہوتی جا رہی تھیں۔ ان سب کے علاوہ مفت خوروں کی ایک بڑی تعداد بھی عموماً مختلف جگہوں پر اور خصوصاً اندر جانے والے دروازہ کے ارد گرد منڈلا رہی تھی۔ یہ لوگ فسٹ کلاس گرم سوٹ پہنے (جن کی جیبیں نقدی سے بالکل پاک صاف تھیں) اور میچنگ "ٹائیاں" لگائے دروازے کی سمت نشست باندھ کر کھڑے تھے۔ اور کسی کام کی غرض سے ہال سے باہر آتے ہوئے مشاعرے کے منتظمین سے مسکرا کر واقفیت جتلانے کی کوشش کرتے تھے۔ خدا خدا کر کے آٹھ بجے ہز ایکسی لینسی گورنر پنجاب چند افسران کی معیت میں یونیورسٹی ہال میں تشریف لائے اور ہال میں سردی کی بجائے گرمی کی لہر دوڑ گئی۔

مشاعرے میں ہر قسم کے شعراء تشریف لائے۔ مگر ان میں اکثریت ایسے اصحاب کی تھی جو محض ٹکٹ خریدنے کی کوفت سے بچنے کے لئے فی البدیہہ شاعر بن گئے تھے۔ جن شعراء کے نام اخبارات اور اشتہارات میں دیئے گئے تھے۔ وہ حسبِ معمول غیر حاضر تھے۔ نہ جانے کیوں؟ تکلفی چونکہ طلباء کی برادری سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ صحافیوں کے حقوق اور دیگر نامہ نگاری مراعات سے محروم ہے۔ پھر بھی تکلفی نے تکلف برطرف رکھتے ہوئے ایک منتظم سے دریافت کیا۔ تو انکشاف ہوا۔ کہ شعراء کو تحریری طور پر مشاعرے میں حاضر ہونے کی دعوت نہیں دی گئی تھی۔ بلکہ اخبارات اور اشتہارات میں ناموں تک ہی پر اکتفا کیا گیا تھا۔ جن شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ ان میں سے طرب لکھنوی۔ ظہیر کاشمیری۔ صوفی تبسم۔ صابری دہلوی اور زہرہ نگاہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ زہرہ نگاہ کے علاوہ چند اور خاتون شاعرات بھی براجمان تھیں۔ مس زہرہ نگاہ نے اپنی سریلی آواز اور ترنم سے کلام سنا کر حاضرین سے خوب داد حاصل کی۔ اور حاضرین کے اصرار پر بار بار اسٹیج پر تشریف لائیں۔ ان کا ایک شعر یاد رہا ہے وہ سن لیجئے اور سر دھنیئے ؎

سُنانے کی خاطر بھلانے کی خاطر
کہیں ہم زمانے کو یاد آ نہ جائیں

المختصر وہی شعراء کامیاب رہے جنہوں نے ترنم سے کلام سنایا۔ حاضرین نے شعراء کی اکثریت کو "ہوٹنگ" سے خوب نوازا۔ شاعر حضرات کی تواضع کے لئے سگریٹوں اور پانوں کے یکے بعد دیگرے مشاعرہ کے اختتام تک دور چلتے رہے۔ تکلفی کو مشاعرہ کی گرماگرم مجلس اور طلباء کی بد ذوقی کو چھوڑ کر ایک خاص کام کی وجہ سے واپس آنا پڑا۔ اور تکلفی کے واپس آ جانے کے جلد ہی بعد مشاعرہ بخیریت تمام ختم ہوگیا۔ اور تماشبین ٹھٹھرتے ہوئے سائیکلوں پر اور پیادہ گھروں کو روانہ ہوگئے۔

تکلفی کی برادری اگر بُرا نہ مانے تو وہ انہیں مشورہ دے گا۔ کہ کم از کم ایسے سرکاری مشاعروں پر جو قومی ضروریات کے لئے منعقد کئے جائیں۔ آپ کی ہوٹنگ۔ پاؤں سے تالیاں اور بد ذوقی آپ کو زیب نہیں دیتی۔

اُردو پڑھیئے ★ اُردو لکھیئے ★ اُردو بولیئے

جنید ہاشمی بی۔ اے

حالی ایک نقاد کی حیثیت سے

مولانا حالی اردو کے پہلے باقاعدہ نقاد ہیں۔ نہ صرف عملی نقاد بلکہ انہوں نے اصول تنقید بھی وضع کئے۔ حالی سے قبل تنقید اپنی ابتدائی حالت میں تھی۔ بلکہ کسی نے سچ کہا ہے کہ اردو میں تنقید کا وجود صحیح معنوں میں تھا ہی نہیں۔ حالی کے زمانے سے قبل فارسی میں تنقید کا صرف ایک ہی میدان "تذکرہ نگاری" تھا جس میں صرف شعراء کا ذکر ہوتا تھا۔ نثر نگاروں کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ایک تذکرہ نگار عموماً اپنی پسند کے بعض شاعروں کی زندگی کے مختصر حالات اور ان کے بعض اشعار پر مختصر سا تبصرہ اور پھر شعروں کا انتخاب دیتا تھا۔ ایسے تذکروں کی سب سے بڑی خصوصیت اختصار تھا۔ اور صرف چند ایک ایسے اشعار کا انتخاب کیا جاتا تھا جس سے شاعر کا نمایاں رنگ ظاہر ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ "تذکرہ" تنقید کا قائم مقام نہیں بن سکتا تھا کیونکہ اس سے کسی شاعر کی شخصیت اور اسکا ذہنی رجحان اور اس کے فن کا ارتقاء واضح نہیں ہوتا تھا۔ تنقید میں نہ صرف شاعر اور شاعری کے تذکرہ کی ضرورت ہے بلکہ شعری اثرات کے تذکرہ کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ پرانی تنقید میں مختصر، محدود، سطحی اور کسی حد تک چھان پھٹک کی بجائے 'ذوق' کے اثرات ملتے ہیں۔ تذکرہ نگاری اصولی لحاظ سے محدود تھی۔ تذکرہ نگار محض شاعر کے خارجی خصائص کو سامنے رکھتے تھے۔ اسی طرح پرانے لوگوں نے زندگی اور ادب کے رابطہ کو سامنے نہیں رکھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی تنقیدوں میں کسی خاص چیز کے اضافہ کرنے کا ذکر نہیں کیا۔ عام چلتی ہوئی۔ بکھری ہوئی باتیں بیان کر دیتے تھے۔

مولانا حالی پہلے آدمی ہیں جنہوں نے معین اصول تنقید کو سامنے رکھا ہے۔ وہ عملی نقاد تھے۔ حیات سعدی۔ یادگار غالب۔ اور حیات جاوید میں انہوں نے عملی تنقید کی ہے۔ انہوں نے بعض خود وضع کردہ تنقید کے طریقے مقرر اور استعمال کئے ہیں۔ مثلاً اول موازنہ ہے۔ یعنی ایک شاعر کے کلام کا دوسرے شاعر کے کلام سے تقابلی مطالعہ کرنا۔ دوم کسی شاعر سے متعلق از خود اپنا فیصلہ دینا کہ انفرادی طور پر وہ شاعر کیا کہتا ہے۔ اور کیسا کہتا ہے سوم کسی فن کار کے کلام کو پھیلا کر پیش کرنا۔ اور اس کا تجزیہ کرنا تاکہ قاری خود اس کے حسن و قبح کا فیصلہ کر سکے۔ وغیرہ۔ حالی نے زیادہ تر موازنہ سے کام لیا ہے۔ مثلاً غالب کی نثر کا مقابلہ ظہوری سے۔ اور نظم کا مقابلہ حافظ۔ عرفی اور نظامی سے کیا ہے۔ حالی ایک خوش ذوق شخص تھے۔ شعر سمجھنے کا مادہ ان کی فطرت میں ودیعت تھا۔ کسی نے خوب کہا ہے "وہ حالی ہیں نہ کہ قالی"

ذوقی لحاظ سے مولانا حالی کی تنقید بے عیب ہے۔ صحیح خوش ذوقی کی یہ علامت ہے کہ جس چیز کو زیادہ سے زیادہ انسانی فطرت قبول کرے۔ اور اس کی پسند کے موافق ہو۔ اس کا انتخاب کرے۔

کلیم الدین احمد نے لکھا ہے کہ

"مولانا حالی کے خیالات ماخوذ۔ واقفیت محدود اور نظر سطحی اور فہم و ادراک معمولی۔ غور و خوض ناکافی۔ تمیز ادنیٰ۔ اور دماغ و شخصیت اوسط یہ تھی حالی کی کائنات"

ان میں سے اگرچہ بعض باتیں درست ہیں۔ بے شک ان کی واقفیت معمولی تھی۔ اور محدود تھی۔ لیکن اس سے کون انکار کرے گا کہ اولیت کے لحاظ سے یہ مولانا حالی ہی تھے جنہوں نے تنقید کے جدید اصولوں کے راستوں سے آشنا کیا۔ اس اعتبار سے ان کا مقدمہ شعر و شاعری۔ ارسطو کی "بوطیقا" کی طرح ہمیشہ زندہ رہے گا۔

"مقدمہ شعر و شاعری" میں وضع شدہ اصول ادب کی بعض بنیادی باتوں سے واقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ ادب پر تنقید کرنے کے لئے لازم ہے کہ ایک نقاد فن لطیف کی ماہیت سے واقف ہو۔ اور اس کی سب سے بڑی روح جمالیات سے واقفیت ضروری ہے۔ حالی نے ادب کو بطور فن لطیف کے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ ادب کا صرف مجلسی اور اجتماعی

پہلو سامنے رکھا ہے۔ مثلاً مقدمہ میں فرماتے ہیں۔ "کہ شاعری شائستگی سے بھی ترقی کر سکتی ہے۔" مولانا حالی شاعری کو ایک تربیت کی چیز سمجھتے ہیں۔ اور اسے صناعتی اور فرمائشی قرار دیتے ہیں۔ اور اس کا ڈانڈا اخلاق سے ملاتے ہیں۔

موجودہ تصوّرات کے لحاظ سے شاعری ایک وہبی وصف ہے نہ کہ بقول مولانا حالی یہ ایک اکتسابی میکانکی اور تدریسی چیز ہے شاعری جذبۂ داخلی کا اظہارِ بے ساختہ ہے۔ لیکن مولانا حالی نے "شاعری کی اصلاح" کی طرف توجہ دی ہے۔ غزل میں اصلاح کی جو تجاویز حالی نے پیش کی ہیں۔ وہ قابلِ قدر ضرور ہیں۔ لیکن وہ ادب کی ماہیت کو سامنے رکھکر پیش نہیں کی گئیں۔ بلکہ حالاتِ زمانہ کے مطابق قومی تقاضوں کے ماتحت کہی گئی ہیں۔ روایتی مضامین اپنا اثر جلد کھو بیٹھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے زمانہ کی مقصدیت کے ماتحت اصلاحات پیش کی تھیں۔ جو اصولِ شعر کے خلاف تھیں۔ شعر کے لئے وزن اور قافیہ کی بحث محض علمی مباحث ہیں۔ اسی طرح لفظ اور معانی کی افضلیت کی بحث ہے۔ در اصل لفظ اور معانی کو الگ الگ کر کے دیکھنا بھی ایک غلط سی بات ہے۔ لیکن باوجود اس کے یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ حالی سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے سائنٹفک بحثوں کو اردو نثر میں کامیابی کے ساتھ ادا کیا ہے۔

حالی نے نہ صرف اردو شاعری کو جدید راہوں سے آشنا کیا ہے۔ بلکہ وہ اردو تنقید کے مجتہد بھی ہیں۔ اور وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تنقید نگاری میں مغربی اصولِ فن کو رواج دیا ہے۔ اور اُردو تنقید نگاری کو تذکرہ نگاری کی سطح سے بلند کر کے ایک علمی اور تحقیقی فن کی صورت دی ہے۔ وہ افراط و تفریط کے قائل نہیں بلکہ اپنے اسی دھیماپن اور سنجیدگی کے ساتھ بغیر دبرنا کی اور نشتر زنی کے اپنی جچی تلی رائے دیتے چلے جاتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ حالی تنقید میں اردو کے ڈرائیڈن (Dryden) ہیں۔

محنت کلیدِ کامیابی ہے

عبدالباسط وحید

"چند لمحے ٹیپو سلطان کے مزار پر"

السّلام اے گوشۂ آرام گاہِ حیدری!

السّلام اے قصرِ شاہی جو کہ یوں برباد ہے
چھائی رہتی ہے یہاں خاموشئ ماتم کناں
سطوتِ خوابیدۂ ٹیپوؒ کی یہ روداد ہے

ملتِ اسلام کی شمعِ فروزاں ہے یہاں
سو رہا ہے اس جگہ پر ایک فخرِ روزگار
فخرِ ملت۔ شیرِ دکن۔ نازشِ اہلِ وطن
ہے اسی ٹیپوؒ شہیدِ قوم و ملت کا مزار

گونج اٹھتی ہے یہاں اللہ اکبر کی صدا
اور ملتا ہے مسلمانوں کو پیغامِ سجود
رحمتِ باری کے بادل چھائے رہتے ہیں یہاں
اور تری تُربت پہ ہوتا ہے ملائک کا ورود

آہ غدّاروں کی غدّاری سے کیا کچھ ہوگیا
بچ سکا آخر نہ ٹیپو بھی فرنگی چال سے
یاد ہے خدّامِ ملت کو مگر تیرا پیام
"شیر یک روزہ ہے بہتر گلۂ صد سالہ سے"

الوداع! رُوحِ مجاہد اے نشانِ حیدری
الوداع! اے عظمتِ اسلام کے نام و نشاں
دیکھ لے اُٹھ کر کہ تیری حسرتیں پوری ہوئیں
قیدِ افرنگی سے ہے آزاد پھر اب مسلماں ★

ROSE BLOOMS SOFT

The rose blooms soft,
And the rose blooms fair;
Now the summer has come

The birds sweetly sing,
And the message they bring
Is: "Come, soul, awake
And of beauty partake."

The rose blooms soft,
And the rose blooms fair;
And the laughter has come
With her merriest air.

The trees and flowers
Make of earth just a bower,
Where blessings from heaven
Seem falling in showers,
While the rose blooms soft,
And the rose blooms fair.

—N. M. NAZ SIDDIQI.

contained in the discharge tube. Their mass was very nearly the same as the mass of the atoms from which they were obtained.

In the light of the above experiments Thomson thought that the atom was made up of a relatively large positive part to which were attached the negative electrons making it electrically neutral. For the time being it was a good picture of the atom but it threw no light upon the structure of the positive part.

—H. U. KHAN, M. Sc.

SMILE A WHILE

Clerk : " Sir, my wife wishes me to take the afternoon off for shopping."

Manager : " Impossible."

Clerk : " Thank you, Sir."

" Why is it that you fat fellows are always good natured ? "

" You see, we can't either fight or run."

" Now class ", said the teacher, "Can you tell me one of the uses of cowhide ? "

" Sure," piped up the customary voice from the back of the room.

" It keeps the cow together."

A worried lady drove a rather battered car into a garage, " Do you think you can fix these front fenders so that my husband won't know I banged them up ? ", she inquired anxiously. The experienced garage-man said, 'We can't do that today, but we can fix them so that you can ask him tomorrow what he did to them."

Boss : We are very modern here. Everything here is run by electricity.

Employee : Yes ! I quite believe it. Even the wages gave me a shock.

According to him atoms of the same element were identical in all respects, particularly in weight, but differed from those of other elements, and that all chemical reactions were really reactions between these atoms.

For about one hundred years the scientists thought of the atom in that way. Then discoveries were made which blew the idea of solid, indivisible atom sky high. Towards the close of the 19th century Sir William Crooks made an important discovery. He was studying the behaviour of an electric discharge through rarefied gas. He fixed two electric terminals at the end of a closed glass tube and pumped out all air from it to create a high vacuum. Then he connected the terminals to a source of high voltage and noticed a visible discharge coming from the nagative terminal called the cathode. He called the discharge cathode rays. Sir J. J. Thomson, another English Physicist, studied these rays in greater detail. He found that the rays travelled in straight lines and that they could be deflected from their straight path in a magnet or by applying an electric field across them. This proved that the rays consisted of bits of matter which were negatively charged. Because of their electrical nature they were called electrons. These electrons constituting the cathode rays could have been formed either by the breaking of atoms of the gas under high electric pressure or from the material of the cathode itself. Thomson passed the discharge through different gases and used electrodes of different material. Still he found that the nature of the particles was always the same. He was, therefore, led to the conclusion that these electrons were a common constituent of all atoms. This also proved that an atom was divisible and that it had a structure involving electrons.

Measuring the charge and the mass of an electron was not an easy job. The scientific skill of Robert Millikan and others, however, overcame the difficulty. It was shown that an electron carried one unit of negative electricity and had a mass equal to 1/1854 of the mass of the lightest atom, hydrogen. This mass is so small that it can scarcely be comprehended. Put down a decimal point, then 27 zeros, and then the figure 9. This gives the mass of an electron in grams*. A layman is liable to call it a mere fancy but it is absolutely correct. These tiny little electrons, so insignificant in mass, are not insignificant in their own field. They are capable of doing a lot of things. In a discharge tube they boil out of the cathode with tremendous velocities and can give us a television picture. When they stream through a wire they constitute an electric current and about 6 billion billion pass through an ordinary 100-watt electric bulb each second. Within the atom they bounce back and forth and produce light, X-rays or other radiations When we burn coal, the carbon atom of the coal and the oxygen atom of the air join together and a reshuffle of the electronic family occurs. This rearrangement of the electrons gives us heat and light. As a matter of fact electrons are involved in all chemical reactions, whether it be the digestion of an egg or the detonation of a TNT bomb. Incidentally it may be remarked here that when an atomic bomb goes off, nothing of this sort happens. The electrons have nothing to do with an atomic explosion.

The electron is not the only particle in the atom. All atoms, on the whole, are electrically neutral. When J. J. Thomson found that by sending an electric discharge through a gas at low pressure negatively charged electrons were torn off from the gas atoms, he concluded that the residual gas should acquire a positive charge and should move towards the negative terminal. He actually found that this was the case. He cut a hole through the negative terminal (cathode) and noticed positive residues rushing through the aperture in the form of streams or 'rays'. These were called positive rays. It was found that the mass and charge of these particles did vary and depend upon the nature of the gas

*A gram is about one-third of a four anna piece in weight.

THE STORY OF THE ATOM

PART 1

WE are living in the atomic age. Every now and then we hear of some atomic explosion occurring in one part of the world or the other. At one time it was thought that the atomic bombs were an exclusive monoply of America but now she is no longer alone in that field. England exploded her first experimental bomb in October last in Australia. There are good reasons to believe that Russia also possesses them in a sufficiently large number. Now there is a race for supremacy and world domination. It is difficult to predict what would be the ultimate end of this rivalry. But this much is certain that the next world war, if and when it comes, will be awfully terrible and plunge the entire human race in untold miseries. Besides the atomic bomb we now have the hydrogen bomb and the cobalt bomb. The havoc wrought by these bombs has been amply demonstrated. The demoniac power let loose on Hiroshima and Nagasaki in August 1945 and the devastating effects that followed are still fresh in our memory.

The first experimental bomb was exploded in July 1945 in the deserts of New Mexico. The scientists who were responsible for the explosion foresaw pretty accurately what was going to happen. Only a handful of men were allowed to witness that explosion but even they really did not see it. Some of them were placed at a distance of ten miles from the scene while others at double that distance. Those who were ten miles away were ordered to be down with their feet towards the blast and their faces turned towards the earth. Those who were 20 miles off had been ordered to stand with their back to the explosion and were given the darkest possible glasses to put on The experiment was performed just before dawn. All the observers were sheilded by a heavy barricade. Still the explosion was an awful experience for them. They saw the distant mountains illuminated with light much more brilliant than the sunlight, which shone on and on until they wanted it to stop. In due course the roar of the explosion arrived with the more modest speed of sound. Some of the observers were so awed by the spectacle that they lost their memory and did not remember having heard any noise. Afterwards came the colossal clouds of turbulent smoke that rose like a whirling crowd of ghastly phantoms. The blast was so terrific that it seemed as though the end of the world had come. The fierce heat melted the sand and rocks so that they flowed together like a stream of lava.

The release of atomic energy places at our disposal great new powers. These powers can be used for good or for ill. There is no doubt that its first use was as a bomb, but the time is not far when it will be used as man's willing servant. Its peace time applications are bound to revolutionise our whole way of life. In order to appreciate these changes properly one should have, at least, some elementary knowledge about the structure of the atom. It is hoped that the present article will be found useful in this respect.*

Ever since the beginning man has been forming conjectures about the make-up of this universe. We have a record that a Greek philosopher, Democritus, some 2200 years back had suggested that "all things are composed of very tiny indivisible bits of matter." It was a brilliant piece of guess work for that age but, as it had no experimental evidence, nobody bothered about it for a long time. The first clear picture about the structure of matter was put forward by John Dalton, an English School Master, in the beginning of the 19th century. He suggested that all matter was composed of very tiny indivisible particles which he called atoms.

*The article is primarily meant for Arts students.

DREAM LAND

—Mahmood Sherani, II Yr.

A few hours before midnight preceeding the 15th August 1947, the streets of my town were bubbling with happy crowds who were out to welcome the Independence of India that was about to dawn and the birth of Pakistan which that august night was to witness. I sat in a balcony commanding the view of busy thoroughfare and was absorbed in gazing at the endless stream of gay-attired, cheery-faced, mirthful noisy people going up and down the highway. Never in my life did I see such an atmosphere of joy all around. It seemed as if all were within the gates of heaven which was all bliss and knew no ills. I was unconsciously trying to fathom the expectations of the masses which that magic word "Independence" had engendered in their minds. They hoped to find themselves in a new world overnight, and a state of reverie transported me for a few moments into that land of their yearnings.

I saw that it was broad daylight and I was in a market-place. Everyone was thanking God for granting freedom from the yoke of an alien rule, which enabled everybody to see the day of peace and prosperity. They said there was 'plenty to eat, drink and be merry', everything was cheap and in abundance. I was beside myself with joy at this universal gaiety. As I advanced a little I was in front of a criminal court. It seemed to be altogether a deserted place. A few policemen were complaining that cases of theft, arson and murder ceased to happen altogether. I enquired of its cause and came to know that people had sworn never to commit any crime. Meanwhile the minister of justice passed by and greeted me with a sincere and cordial salute. I was dumb-founded at his humility but he assured me that it was the order of the day because the ties of a common brotherhood bound together the rulers and the ruled. I do not remember how long I sat enjoying these imaginary scenes of the would-be-free country, when suddenly I was torn away by the call of a cousin who diverted my attention to some other affair. However the following days brought before my eyes such horrible scenes of man's brutality that many had cause enough to curse the Independence and all that came in its wake.

Hope, nevertheless, has not yet died and nearly every one of us prays to God that the "Dreamland" of our anticipated peace, prosperity and universal salvation may yet be granted to us in the days to come :—

Despite all sorrows and innumerable disappointments I still behold my country as a magnificent castle and wish that this castle should no longer remain in in the air.

OUR ROWERS

The College Rowing Team deserves our heartiest congratulations on its three successive victories this season.

It has won the Ghani Zaman Tournament, the University Bumping Boat Race and the Punjab Rowing Championship.

Our hats off to the Rowing Team and its President, Ch. Mohammad Ali, M. A.

HILLS REMIND ME

Hills remind me of home, and
Of all those trifling things precious to me ;
Of the cock that crows at dawn
And of cows ; and chicks that broke out
Of their brittle shell on the twenty-first day ;
Of the ancient parrot who repeats all he knows
And will not learn the new ;
Of the rickety wooden watch-tower in the field
Where the watcher shouts at the birds all day ;
Of the rattling cart on the winding road
And the strangely laden caravans of camels
Marching from the west with the burning sun.

They remind me too of toddy palms
Where the weaver-birds build in each mon-soon ;
Of the sugar-cane groves where jackals call at night
Bent on their delicious destruction ;
They remind me of the cowherd leading the cattle home,
And the songs of the ripened rice
That women sing, bent at their grinding mill.
Suddenly today your hills remind me of mine
And I am not at rest .....

Hills remind me of home, and
Of all that is best in life ;
Of the love that ever awaits me steadily,
Unflinching like these very hills ;
Of the implicit faith (it often rebukes me mutely)
Which thinks that her son is to be great one day.
In rain and shine they stand and remind me
Of those who dream dreams and hope hopes
For me in that far away land.

Suddenly today your hills remind me of mine,
And the warm welcome that I always crave
And I yearn for home, my home.

N. M. NAZ SIDDIQI.

THE TALE OF A DICTIONARY

YOU might have read in your school days, if you care to remember, the life history of a chair, the biography of a coin, etc. I hope you are not too busy today to hear another such tale—the tale of a dictionary. Since, at this stage, it is quite impossible to make you believe that a book, too, can possibly speak like us, I undertake to tell all about it myself.

Of all the things of which I enjoy the rights of ownership, the only one that reminds me of antiquity is my worm-eaten, weather-worn dictionary which my fa.her presented to me when for the first time, in the history of my life, I was going to step into the premises of a college, with an advice to make the best use of this humble present. It came into my hands mourning the loss of its original covering. However, I got it bound anew thinking that if it had nothing, at least it must have a nice covering which was its birth-right, although in the present condition it hardly merited one. Not to speak of the fly-leaves, even the very outer leaf, on which the name of the book is usually printed, had deemed it better to share the sorrow of the cover. Its first page now starts with the letter A, where on the top is inscribed its name in bold print ' A Modern Dictionary ', of which the facts are only a cruel mockery.

Hardly any day do I open or move it from where it lies, not because of my holding it in reverence or becouse I have cast it into a deserted nook. No, neither is the case, (It does enjoy equal rights with my other books in that it lies on the table all the time), but because it does not admit of even a careful handling. And if I open it or turn over its pages, I am scared I'll rob it of one or two of its age-old faithful companions.

It is always a source of inspiration to me. (And to those who may be suffering from what I may fitly call inspirational constipation, a glance at it may lend speedy recovery). Whenever I gaze at it, I feel I am gazing at an autumnal scene. I see the dry faded leaves of some tree falling down and floating in air, or a tree wholly stripped of its foliage standing sadly with its bare boughs and twigs, waiting for the approach of the next spring. Yes, it is like a tree which before having had its last autumn had had its last spring and whose leaves, frail though they were, baffled the fury of the winds.

The names and initials on its various pages reveal the statistics, less by one, of those fortunate persons, who had, in their time, the honour of either purchasing or receiving it as a present. It belongs to me now, I am sure, but for the reason already given I have never done so much as endeavour to open it (save once when my father had ceremoniously offered it to me and when my curiosity for the antiques had persuaded me to examine each of its several pages), let alone intialling or writing my name anywhere for which, even if, I have an intense inward urge, I am not likely to find a bit of blank space.

Although even now it lies before me and another fond scrutiny can give a clue to many other interesting facts about it, yet I think I had better give only a retrospective description of this paternal gift, which I intend piously to hand down to progeny as a heirloom.

IJAZ-UR-RAHMAN.

PIN PRICKS

WITHOUT the flowery touch of Prof. Akhwand's flowers the spring issue of 'Almanar' looks rather cold. All the flowers barring a few minor varieties having been exhausted, the hot-house of his cyclopaedic knowledge is expected to develop new species worthy of his picturesque style and scholarship !

At the recent mess Athletics, records were broken, kettles were emptied and chapaties disappeared at the magic touch of our athletes. One useful discovery made on the occasion was that the food problem of Pakistan could be solved if these worthies were shipped to America. Diplomatic courtesy and human sympathy, however, demand that due notice and warning should be given to the unfortunate hosts.

The Staff and students have throughout been very keen to increase its present number of pages the thin, meagre sixteen. But alas ! they could'nt succeed. It will be readily seen as the tiny, old 'Almanar' is still in its teens.

The programme of our All Pakistan English Declamation contest was published in a mysterious language. Experts on cuneiform and heiroglyphic writing declared that it definitely resembled pre-Chaucerian English. Caps off to the Dastkari Press !

Judging from the number of college colours likely to be awarded this year, the College Convocation promises to be a colourful ceremony. K. I..

The Chair, at a recent meeting of the Colllege Union, requested a vocal member of the house to leave the Hall to exercise he vigour of his larynx outside. The *honourable* member, however, declined to leave as he was on leave. The President, therefore, had to ask those not on leave, to leave as a happier alternative.

OBITUARY

The Editorial Staff of 'Almanar deeply mourns the death of Khan Zulfiqar Ali Khan Gauhar, the elder brother of the late Ali Brothers. He passed away into eternity after a long illness on the 26th February. We extend our profoundest sympathies to Khan Habibullah Khan, Lecturer in Chemistry and the other relatives of the deceased. May God shower His choicest blessings on the departed soul, and grant the survivors fortitude and strength enough to bear this loss.

—Editor.

The Jhimpir Rail Crash

On hearing the news of the calamitous disaster the staff and the students of the College passed the following resolution and its copies were sent to the Press and the Governor General along with a cheque for Rs. 200. —Editor.

RESOLUTION

This emergent meeting of the Staff and students of Talim-ul-Islam College, Lahore, places on record its deep sense of sorrow and grief at the appalling loss of human life in the recent Pakistan Mail disaster, and extends its sincerest feelings of sympathy to the bereaved relatives of the victims. It considers this accident to be a national tragedy. It further recommends that a Governor General's fund be created to help the dependants of the victims. As a humble token of the profound feelings of sympathy and regard for the victims, this meeting sends a sum of Rs. 200 to be utilised in providing instantaneous relief to the affected families in the midst of their mourning and distress.

—M. N. AHMAD, M. A. (Oxon)
Principal.
—KUNWAR IDREES, Vice-President,
College Union.

information considerably eased me. Speaking about his experience I—told me that the easiest way of getting rid of a "police pest" was to convince him that you were closely related to some "big gun." "If, perchance, you fail at it, a four anna bit (he winked at a policeman nearby) is bound to do the trick." When I enquired of him as to how he got caught, he replied that the Cop who had been responsible for sending him there, did not accept the current normal rates to let him go, but had demanded the black-market price, and he, being an honest man, would rather die than support black marketing in any branch of business whatsoever.

We were half way through our discourse when the court began its work. In due course my name was called out, and with the assurance and good wishes of my honest friend I placed myself before the magistrate. "Did you ride a bike without a light?" I nodded my head as per instructions of my worthy friend I—. "With every new argument you put forth," he had informed me "the fine is apt to be raised, a straight acquiescence is always best"

I was sentenced to pay a fine of Re. 1/- or to undergo one day's simple imprisonment in lieu thereof. I preferred to pay the fine and returned home.

I have since this adventure been conducting researches in the matter, and now I begin to wonder whether I had not better gone to the prison instead of paying the fine. Newspaper boys, street vendors, and tonga *wallas* constitute the majority of the culprits, and I am reliably given to understand that they never pay the fine but choose to get behind the bars. A day's rest off and on is quite a welcome thing and what more could be desired if food also is served free to them.

Well, my point is, you need not be a tonga *walla* or a newspaper boy to enjoy such a holiday. Even if you are a student of the final year of your class I fail to see how any tutor or even a principal can be so hard-hearted as to refuse you leave if you want to go to prison. You can read your Sherlock Holmes or solve your crosswords, while there.

Students had better go in fours so as to form at least a bridge party. And for our politicians and authors there is nothing more capital than to study prison conditions at first hand.

Personally, I prefer to solve crosswords in a gaol. You have earned a holiday and a couple of rupees by declining to pay the fine, what is more sensible than devoting your time and money to win a five figure cheque. But, somehow, my friend I—fails to grasp the far-reaching effects and benefits of my way of spending time. He insists on going to prison with his banjo.

And now for those who may yet feel disinclined to go to court and get imprisoned—a renegade mentality in my opinion—I set forth here a few tips (1) Be well dressed preferably in English costume. (2) Have some change about your person, perhaps, this may do the trick if luck is not completely in (3) Have the address of some "big gun" (preferably of police force) always handy."

As one, who has taken some pains to study this problem at first hand, I can say with authority that if you try to "make a dash for it", that won't do, amateures are apt to think otherwise, but it is a fact that every Cop has a whistle and if he uses it, ten to one, you will be run down before you are able to bowl yourself out of reach.

A BIKE WITHOUT A LIGHT

—Ahmad Saeed, III Yr.

ONE day after having completed my science practical, I was heading homewards. The practical had been a rather lengthy one, and the days of the winter being short, it was almost lighting time in the evening.

The weather was pleasant and I was wafting along the Mall in a pleasant, refreshing and invigorating cool breeze. Such a weather seems even more charming if enjoyed after a day's hard work. So to enjoy myself fully I took up my favourite whistling tune.

I had not yet covered half the Mall when suddenly from around a corner, a very decent looking Cop stepped in front of me with a smile on his face. And now you very well know the mood I was in, and from the benevolent appearance of the man also it never occurred to me that he might be out for mischief.

As the Cop was all smiles, I thought that he wanted to ask me something regarding the way back to his barracks or, perhaps, had run out of match sticks; so anticipating the latter, I offered my match box and cigarette, too, into the bargain. The Cop thanked me as he handed back the match box, looked up my bike and observed in a most casual manner, "looks you have no arrangement for light, eh!"

I was far from guessing his intentions; I could only make out that he, perhaps, was sympathising with me for the rickety condition my bike was in. So I put on a broad grin and said "Oh! what is the idea of keeping a dynamo when one can very well do without it? Besides this is not my bike." He broadened his smile into a grin and asked me as to where I was putting up. I told him with an air of frankness that I was putting up nowhere other than at my own home; he then desired to know my address; I tried to make it crystal clear to him in that very tone, that as I had no intention of inviting him, he had no need of it. "In that case" he said, "you had better step into the police station and tell that to the Sub-Inspector."

Imagine that! for a moment I thought he was kidding. But no, there he was cool, smiling and repeating it to me when the very trail of smoke from my cigarette lighted by my match box was coming out of his mouth and nose. Violent fury overtook me and I was about to tuck up my sleeves and give him a piece of my mind, when I remembered: 'it seldom pays to strike a policeman.' What was I to do? Even as I was contemplating a dash on my bike, or to cry "a thief, a thief" and run, the fellow took charge of my bike and commenced rolling it towards the police-station.

I left my address at the police-station and walked home with my bike, in the mood you can guess.

A few days later I found myself on a visit to courts. All types of men started dropping in, ones and twos, and as the time for the commencement of court drew near their number gradually increased. Cold and fear of appearing before a magistrate were making me miserable, when fortunately, I spotted I— (my friend-cum-classmate) moving about the court room, as if he owned it. The easy confidence with which he carried himself about the court and chatted with the policemen immediately convinced me that he was pretty well experienced in the line. When he saw me, he rushed to greet me as if it was him I had come to see. Any way, my "all-knowing" friend informed me that we were having a lenient magistrate for the day. "If it were Mr. X" he said, "you could not get off for less than five chips." This

Jack whom he resembled after all ?" Jack told him that in spite of his pale cheeks and haggard eyes he was not quite unlike his ownself and further he told him hat it was this thing, in fact, which had frightened him much more than any other thing there and it was due to this that he had lost his senses.

Hearing this thing the Captain shrank back into his chair, for the coming events were casting their shadows before. Once again the old horror caught hold of him and he was able to see the ghost of his friend, Sonie, perambulating there, in the darkness of the night. New fears were now cropping up in the heart of the Captain; he was thinking how the ill-fated Jack would die there in his dismal cabin.

The harrowing figure of Death was the sentinal at the gate of his little abode and life was the inmate, fearing and startled all the time.

Jack was becoming more and more uneasy. His pale face was becoming paler, his pining looks were pining more and his weakness increasing every moment, it seemed as if the White Shadow of Death was haunting the dusky corners of his mind, making him miserable and terrified.

The night bird was still singing, the music of the distant waves was unsubdued and the dusk of the night was still lingering overhead. The late hours of the wintry nights are usually colder and darker; so were the hours of that night. The air was slashing, like knives across the face, outside and the atmosphere was touched with frost at that moment. Frozen, thin figure of Death was haunting the spot; Life was nowhere to be seen, the former waking and the latter sleeping.

There was no sound coming from the cabin, standing companionless on the lonely shore. But the light, which was coming through the windows, indicated clearly that some human being lived there.

It was in the later part of night that a shrill cry rose from that little abode, in which the Captain and Jack were sleeping unaware of the nocturnal happenings of the world outside. The Captain was fast asleep now but Jack was waking for he had seen a shadow moving about in his cabin and was, therefore, much afraid, and the cry, which had risen from the cabin was his. He was trembling with fear and was fainting.....
When the Captain got up the church bells were ringing. The day had dawned. The night bird was gone, the magpie. was, now, piping outside and the sea birds flew and wheeled and screamed merrily near the shore.

The Captain had tried his level best to keep the long vigil at night but could not resis. the spell of sleep at last. He was sad; two large tears weer hanging pathetically on the eye-lashes Jack had died at last, early in the morning and had gone for ever from this world to those mysterious regions—

Where, they say, doth dark prevail,
The breath where stills and sight doth fail.

Sayings of Holy Prophet

He dieth not who giveth life to learning.

He who neither worketh for himself, nor for o hers, will not receive the reward of God.

Those who earn an honest living are the beloved of God.

The best of alms is that which the right hand giveth, and the left hand knowth not of.

the night. Jack smiled once or twice to his master to allay his worry about him. But his occasional signs of fear showed that he had not completely forgotten the shock of the happening. The Captain was noticing something very queer in his looks, for, when he tried to smile, a wave of terror swept over his face.

In the course of their talk he paused to think of some brief unconscious anxiety about something and this, I may tell you, was not also escaping the close observation of the Captain. He watched every gesture and movement of the old sailor and saw that he was not so happy as he was posing to be before him.

Jack was in fact not so well as he was trying to appear to the Captain. However he did not want to displease and worry his master by his own suffering. He, therefore, smiled and talked and told him that he was better now than before. This he said outwardly, whereas, in fact, the paralysing sense of some gruesome calamity was constantly disabling his heart and the effects of this fear were visible on his pallid face.

The Captain, on the other hand, was struggling hard with his curiosity, which had been stirred by that dreadful event at night which had made his hair stand on end. He wanted to know what had happened to him after he fell into a state of unconsciousness. Once roused, curiosity cannot be expected to content itself with only the maintenance of silence, it rather finds expression in our talk somehow or other in the form of a strange question. So, at last, the Captain asked him what he had seen in the evening and how he had lost his senses in consequence.

Jack in return related to him the whole story with his senses all intact but often pausing to listen for the sounds that were rising in the depths of his heart and causing it to palpitate heavily. He found the Captain fidgetting restlessly in his chair as if intimidated by some coming misfortune. His own fear, therefore, was also increasing and the paleness of his face now turned into whiteness. When he described the shape of that frightful figure which he had seen in the lonely hours of the night, a renewed feeling of panic shook his entire frame and caused him to faint for that particular moment.

Signs of sorrow and compassion were now visible on the face of the Captain, though fear also was diminished. He tried to console his old Jack and told him in a soft, sympathetic tone that it was nothing but an illusion. But how could a reality be converted into a mere dream by such consolations? Jack's heart was, as they say, sinking into his boots and he was sure about the outburst of some future trouble; and you know all that the first shock of a trouble is always a terrible thing for the poor sufferer so was it for our old Jack. He was nipped at heart and down in the mouth uttering some mysterious things, wincing and starting in the midst of his thoughts as sometimes the children do in sleep. The Captain was more and more absorbed in thoughts and was in a state of delirium. He was a weather beaten man who had varied experiences of the world. The extraordinary occurrence of the past night came before his eyes once again in a vague vision He was able to recall to his memory different events of his past life. He was still able torecollect how he had once heard from the Scotch peasants that there were somethings, named TODTEN VOLK, which often appeared at night walking in a procession. He remembered as well how he himself had seen them once before the death of his friend, Sonie, walking in the graveyard of Yorkshire, in a procession and wearing quaint old clothes, something like the veils, with covered faces of all but the last, who had turned his face to him and he was not unlike his friend Sonie, who had died the other day before the garden of his house. All such memories werebeing resurrected in his mind, he was, therefore, ill at ease at that moment of his life. He was expecting some future mishap relating either to him or to Jack, so, at last, he could not refrain from asking the question any longer. "Do you remember,

Believe it or not, a friend of mine honestly thinks that prolonged use of American wheat will turn his swarthy complexion into pink white. And I am afraid if this belief becomes common, toilet soaps and face creams would cease to have any attraction for students; instead we may find packages of wheat or flour in their almirahs. I would, therefore, advise the mess authorities in their own interest, to put a stout lock at the door of the store- room.

Thanks to the hostel residents, they have done full justice to the American wheat and its various products.

THE TODTEN VOLK

—Mohsin Akhwand, M.A. Class (Final)

THE night was dark and cold. From a distance the waves of the sea could be heard beating upon the lonely shore. The oldman was sitting listening and waiting in his tiny cabin by the sea. Suddenly he heard a sound and taking his lamp he stepped out into the darkness. It was all what he had expected; but no, it was not the captain, it was somebody else. Somebody else, of course, wearing a transparent, white veil hanging down to his feet. He could not guess who it could be at such a dreadful hour of the night.

He proceeded to know who 'he' was. To his great surprise he found that 'he' was not alone, many other persons were with 'him', going in a procession. The faces of all others were covered but 'his', and it was 'he' who was seen at first by the old Jack in the light of the little lamp. His figure was grim, pale and bony, with stony, faded eyes, set back in their sockets, and an atrabiliary smile playing on his dry lips.

It was a terrible figure! The wan light of Jack's lamp was adding to the pallor of this already cadaverous thing. The dusk of the night was aggravating the horror which at the time filled the spot, and the boom of the distant surge broke the sullen silence of the night. And poor Jack! He was gripped hard by the prevailing horror. "What can it be?", said he to himself in almost a whisper; to which he found a ready answer waiting there in the abrupt disappearance of that mysterious figure in the obscurity of the night. Such a weird sight in such a place was inconceivable to his perturbed mind and he sank into a coma. The lamp came down on the ground and the light flared out instantaneously as it fell.

Poor old Jack! He did not know what happened afterwards and where the figure had gone but the fact is that the horror of that unexpected incident was there in his mind paralysing his senses and creating a dreadful consternation, which swayed his body and soul.

It was in the late hours of the night when to his great amazement he found that he was lying comfortably in his cabin. His bed was placed in its southwest nook and the lamp was glimmering in the other corner faintly. The Captain was sitting near him on an old chair, his face worn out and hair touzled, indicating clearly that he had not been able to sleep that night. No sooner did the Captain see him open his eyes than a little hope fluttered in his heart.

Jack had served him for ten years and was very dear to his master because of his faithfulness and obedience. He, therefore, was very much dejected. He tried all means to compose him and attended on him vigilantly throughout

AMERICAN WHEAT

—Ijaz-ur-Rehman, III Yr.

THANKS to the American and Pakistan Governments, the country had a very narrow escape from the jaws of famine, to the latter for her timely realization of a frightful crisis and to the former for her offering a handsome quantity of wheat to the latter, free of cost. Otherwise the monster of famine would have played such havoc as would cause even the history of Londonderry to pale into insignificance. Everyone's face naturally beamed with joy when the tidings of the arrival of the first instalment of this colossal supply spread like wild fire from the very metropolis to the far-flung districts. Of course, our Prime Minister and the Government left no stone unturned in prizing the generosity and benevolence of the American people.

Much has been said and talked about the wheat before and after it has made its appearance in our country, and for a long time it conitnued to be the top ranking subject of discussion in coffee-houses, hotels and elsewhere. In the beginning I had heard instances that some of the most patriotically disposed unreservedly expressed their hatred for it as they have been keen to patronize indigenous products, but with the passage of time, whereas those high sounding slogans have subsided, I hope the patriotic enthusiasm would have waned too.

We are grateful to the two governments that some of our mess athletes were spared the trouble of cutting their meals short, and now that the fear of famine is almost over and the price of wheat has somewhat fallen down, a few more apprentices are seen along with the old hands. Some of our friends are prone to believe that the curry that is served in our mess is, also, American and, therefore, they enjoy a very liberal hand at the dishes. But unfortunately a class of our mess members has, on the other hand, suffered a good deal. I have happened to meet some of them who complain that the bread made of this wheat is very indolent and slow-digesting. Once it gets into the stomach it does not easily find a way out and special means have got to be resorted to for its elimination. I wish our American brethren had been kind enough to have sent a few grosses of fruit-salt as our members are far from accepting any drinks with their meals.

It is strange to note that by eating American wheat our friends are undergoing healthy changes. Most of them have cast aside their old oriental dresses and have developed a strong liking for pants and coats of the latest American cut. The rest are expected to complete their metamorphosis in due course. Some of them, of course, persist in appearing in their Pakistani outfit. Those, I think, require a big dose and as soon as the required amount gets administered, they are sure to join the rest. This change from *shalwar* to pants and *achken* to coat also leads me to think of another substantial reason. The Landa Bazar merchants are doing roaring business while the traders in home-made cloth are found with long faces. However, it makes little difference whether the change is due to the arrival of American wheat or clothes.

That's not all. American wheat besides its many other benefits has brought a major change to the dispositions. Those who used to be peevish and arrogant have become cheerful and good-humoured, those who were at sea in certain subjects are getting admirably skilled in them; one student who was at home in Mathematics failed hopelessly in the recent house examinations. And for the same reason those, whom American wheat has favoured, one way or the other, never miss their meals. They are always punctual to the mess timings as a result of which the mess furniture becomes inadequate.

Editorial

The Conception of Originality

TO conceive of something original is, perhaps, the hardest task for an intellectual as well as a manipulator—nay altogether impossible. Everything which has been conceived, written or made in this world is either totally or partly imitated. A writer while introducing his pen-work may widely claim originality and a complete new conception of his own mind. A scientist while making a new addition to the already invented scientific material may present it as an absolute invention of his own fertile brain. But the root of every new-work whether pertaining to art or science is invariably found in the remote past.

To an ordinary reader every new novel, or piece of fiction written, may appear to be original in all respects, but to a person equipped with a deep scholarship and gifted with a wide outlook, every new thing published and in fact every new word used seems to be a modified reproduction of the work of great ancestors whose bones have already mingled with the soil. Similarly every new invention in the field of science has its links with the out-of-date and obsolete inventions of the past. Just to give an example, we may credit the Wright Brothers with originality in inventing the aeroplane, but it is nothing more than a mere scientific and more accurate modification of an air-balloon of which we have heard so much since the medieval and even pre-historic ages (and how frequently it is mentioned in the *Arabian Nights* which provides a delightful reading even today).

To my mind nothing is original in this universe except the creation of the universe itself. History repeats itself and with it everything is repeated to a varied extent, mostly effecting slight changes and sometimes giving the same old copy of events with the only difference that the dust of time is brushed off by new energetic hands, The wine is always the same, the bottles and labels are changed every time. This should not create any misunderstanding and should in no way be taken as an attempt to lessen the utility of this 'art of modification' within the range of imitation. It cannot be regarded as deceptive, because it is inevitable if the dreary monotony of things is to be avoided and their flat staleness minimised. There is always room for modification, improvement and polishing, but to talk of virgin originality is a complete absurdity. I will go to the extent of saying that even the formation of a new idea requires the putting together of many minds and sometimes it is after generations that a clear-cut notion is formed. Hence to speak of an individual as an original genius becomes ludicrous and irrational on the very face of it.

I think the above lines will satisfy or at least appease the reader, who lodged a vhement complaint with the Editor, 'Almanar' that the pages of the magazine lacked what he conceived to be the stamp of originality. Of course we do not claim the originality of thought in the articles and poems published in our magazine, but the manner and language are purely the result of contributor's own endeavour. One thing should not be lost sight of while judging the standard of writings that it is purely an effort of an immature and juvenile brain. The prime object of magazine is to inculcate the habit of writing on our own students and to encourage such efforts as far as possible. Otherwise we could easily make it "original" by borrowing and copying, as is the prevailing custom which flourishes unchecked, though gaining on the economic side but totally losing as far as the moral aspect of the matter goes.

Editorial

The Conception of Originality

TO conceive of something original is, perhaps, the hardest task for an intellectual as well as a manipulator—nay altogether impossible. Everything which has been conceived, written or made in this world is either totally or partly imitated. A writer while introducing his pen-work may widely claim originality and a complete new conception of his own mind. A scientist while making a new addition to the already invented scientific material may present it as an absolute invention of his own fertile brain. But the root of every new-work whether pertaining to art or science is invariably found in the remote past.

To an ordinary reader every new novel, or piece of fiction written, may appear to be original in all respects, but to a person equipped with a deep scholarship and gifted with a wide outlook, every new thing published and in fact every new word used seems to be a modified reproduction of the work of great ancestors whose bones have already mingled with the soil. Similarly every new invention in the field of science has its links with the out-of-date and obsolete inventions of the past. Just to give an example, we may credit the Wright Brothers with originality in inventing the aeroplane, but it is nothing more than a mere scientific and more accurate modification of an air-balloon of which we have heard so much since the medieval and even pre-historic ages (and how frequently it is mentioned in the *Arabian Nights* which provides a delightful reading even today).

To my mind nothing is original in this universe except the creation of the universe itself. History repeats itself and with it everything is repeated to a varied extent, mostly effecting slight changes and sometimes giving the same old copy of events with the only difference that the dust of time is brushed off by new energetic hands, The wine is always the same, the bottles and labels are changed every time. This should not create any misunderstanding and should in no way be taken as an attempt to lessen the utility of this 'art of modification' within the range of imitation. It cannot be regarded as deceptive, because it is inevitable if the dreary monotony of things is to be avoided and their flat staleness minimised. There is always room for modification, improvement and polishing, but to talk of virgin originality is a complete absurdity. I will go to the extent of saying that even the formation of a new idea requires the putting together of many minds and sometimes it is after generations that a clear-cut notion is formed. Hence to speak of an individual as an original genius becomes ludicrous and irrational on the very face of it.

I think the above lines will satisfy or at least appease the reader, who lodged a vhement complaint with the Editor, 'Almanar' that the pages of the magazine lacked what he conceived to be the stamp of originality. Of course we do not claim the originality of thought in the articles and poems published in our magazine, but the manner and language are purely the result of contributor's own endeavour. One thing should not be lost sight of while judging the standard of writings that it is purely an effort of an immature and juvenile brain. The prime object of magazine is to inculcate the habit of writing on our own students and to encourage such efforts as far as possible. Otherwise we could easily make it "original" by borrowing and copying, as is the prevailing custom which flourishes unchecked, though gaining on the economic side but totally losing as far as the moral aspect of the matter goes.

ALMANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE MAGAZINE

March, 1954

★

Staff Editor
Prof. Akh. M. ABDUL QADIR, M.A.

Editor
KUNWAR IDREES

Asstt. Editor
IJAZ-UR-RAHMAN

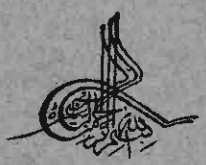

يآيها الذين امنوا اصبروا و صابروا و رابطوا
وتقوالله لعلكم تفلحون ـ

210 - O ye who believe ! be steadfast and strive to excel in steadfastness and be on your guard and fear Allah that you may prosper.

Ch. 3. Al-Imran, Pt. 4

★

CONTENTS

		No.
Editorial ...	Kunwar Idrees	2
American Wheat ...	Ijaz-ur-Rehman	3
Todten Volk ...	Mohsin Akhwand	4
Bike without a Light ...	Ahmad Saeed	7
Pin Pricks ...	Kunwar Idrees	9
The Tale of a Dictionary ...	Ijaz-ur-Rehman	10
Hills Remind me ...	Naz Siddiqi	11
Dream Land ...	Mahmud Sherani	12
The Story of the Atom ...	Habibullah Khan	13
Rose Blooms Soft ...	Naz Siddiqi	15

Printed at the Lion Press, Hospital Road, Lahore and Published by A. R. Junaid for the T. I. College, Lahore.

Almanar

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE